علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے تصورِ فقر کا تقابلی جائزہ

(مقالہ ایم فل اقبالیات)

مقالہ نگار

عزیز الرحمٰن عزیز

ایم۔اے، بی۔ایڈ، فاضلِ فارسی

ماڈرن پرشین کورس (تہران) ایران

رجسٹریشن نمبر: 98-PRI-6130

رول نمبر: H-7848313

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی

سابق صدر شعبۂ اردو/ اقبالیات

سابق ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
Acc. No.
Date

شعبۂ اقبالیات

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

2008ء

سرٹیفکیٹ

عزیز الرحمٰن عزیز نے اپنا ایم فل اقبالیات کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''علامہ اقبال اور مولانا روم کے تصور فقر کا تقابلی جائزہ'' میری نگرانی میں مکمل کرلیا ہے۔ میں مقالے کی تحریر اور تحقیق سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ میرے خیال میں یہ مقالہ اپنے معیار کے اعتبار سے ایم فل اقبالیات کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

(پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی)

سابق صدر شعبہ اردو و شعبہ اقبالیات

فہرست ابواب

		صفحہ نمبر
دیباچہ		i
باب اول:	فقر کی تعریف اور پس منظر، اسلامی تصوف میں فقر کا مقام	1
باب دوم:	علامہ اقبالؒ کا مطالعۂ اسلام، تاریخ اور فلسفہ پر عمیق نظر	19
باب سوم:	علامہ اقبالؒ کا عشق رسولؐ اور اسلاف سے قلبی لگاؤ	32
باب چہارم:	علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے ذہنی روابط	57
باب پنجم:	علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے کلام میں فقر کی اہمیت	121
باب ششم:	علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ تصور فقر کا تقابلی جائزہ	205
باب ہفتم:	حاصل مطالعہ	226
☆	کتابیات	232
	بنیادی ماخذ	232
	کتابیات فارسی	233
	کتابیات	233
	تحقیقِ مقالات	236
	انگریزی کتب	237
	انسائیکلوپیڈیا	237
	رسائل وجرائد	238

مولانا رومؒ

علامہ محمد اقبالؒ

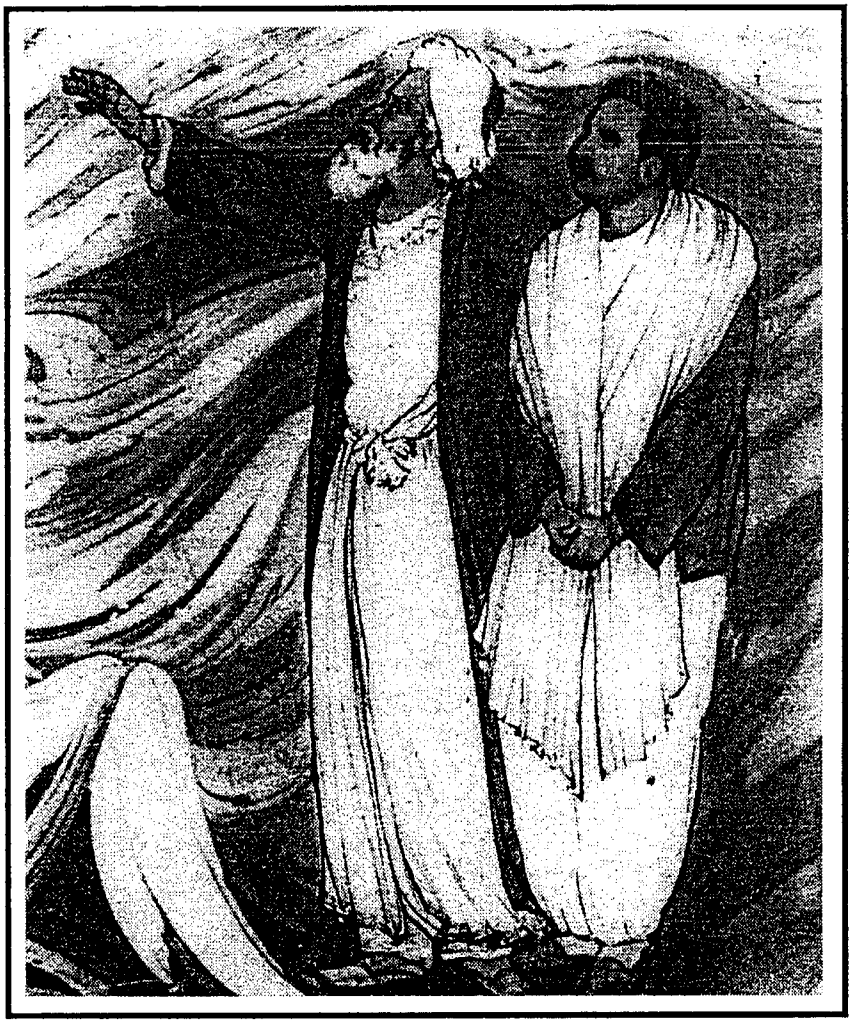

دیباچہ

علامہ اقبال ایک نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ وہ نہ صرف پاکستان کے قومی شاعر ہیں اور انہیں حکیم الامت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے بلکہ انہیں عالم اسلام کے عظیم مفکر، فلسفی، حکیم اور شاعر ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ آپ کی شاعری اصلاحی اور تبلیغی ہونے کے باوجود فن کے جملہ لوازمات سے مزین ہے۔

علامہ اقبال صرف ایک شاعر اور مفکر ہی نہیں بلکہ ایک ایسے ہمہ گیر فکری انقلاب کا نام ہے کہ جس نے نہ صرف اپنے زمانے کی شخصیات بلکہ آنے والی نسلوں کی فکر میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب برپا کیا۔ ان کی کئی فکری جہات ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا تا رہے گا کیونکہ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔

علامہ اقبال کے پیام کی اساس سے صاف نظر آتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ان کا شعور اپنے ارتقا کی منازل طے کر رہا تھا تو انہوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ ملت اسلامیہ ہر کہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، ملت اسلامیہ کو آزادی دلوانے اور سرفراز دیکھنے کی تمنا میں انہوں نے شاعری سے ایک انقلابی اور دعوتی کام لیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کی بدولت قوم کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسلامی قومیت کے تصور کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے قوم رسول ہاشمی کی اہمیت اور انفرادیت کو پیش کیا اور ملت کو یہ واضح پیغام دیا کہ نہ تو مشرق سے بیزار ہونے کی ضرورت ہے اور نہ مغرب سے حذر کرنے کا کچھ فائدہ۔ امت مسلمہ سے بے عملی ختم کرنے کے لئے اپنا مشہور تصور خودی پیش کیا اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا کہ استحکام خودی کے لیے عقیدہ اور عمل کی بے حد ضرورت ہے ساتھ ہی بے خودی کے رموز سمجھاتے ہوئے ملت کو اجتماعی طور پر زندہ قوم بننے کا پیغام دیا۔

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ

ہست شیطان از جماعت دور تر

اقبال کی فکری تربیت میں مشرق ومغرب کے فلاسفہ اور علوم وفنون نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشرق میں علامہ اقبال مولانا رومؒ کے فکر وفلسفے سے زیادہ متاثر ہیں۔ یہ سلسلہ اس قدر بڑھتا ہے کہ اقبالؒ مولانا رومؒ سے اپنی والہانہ عقیدت میں انھیں پیر رومی کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا رومؒ نے اقبال کی فکری اساس میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فکری سطح پر ان دو بڑے مفکر شعرا کا فکری تقابل کیا جائے۔ رومی اور اقبال کی فکر میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ ان میں سے ایک فقر بھی ہے۔ مجھے آغاز ہی سے اس موضوع سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ شعبۂ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے مجھے یہ نادر موقع فراہم کیا کہ میں اس موضوع پر کام کر سکوں۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول میں فقر کی ماہیت اور فقر وغنا کا اسلامی تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس میں فقر دین و دنیا کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے نیز فقر کے آداب بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

باب دوم میں اقبال کے مطالعۂ اسلام، تاریخ اور فلسفے کو واضح کیا گیا ہے تا کہ اقبال کے تصورات کی اسلامی اساس کا تعارف ہو سکے۔

باب سوم میں اقبال کے عشق رسولؐ اور اسلاف سے قلبی لگاؤ کو واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے ذہنی روابط کو سامنے لاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا روم کے مختصر حالات زندگی اور تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اقبال کی ان سے عقیدت مندی کو تصانیف وفکر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں علامہ اقبال اور مولانا روم کے کلام میں فقر کی وضاحت کے لیے اس باب کو دو حصوں مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کے تصور فقر میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب ششم میں علامہ اقبال اور مولانا روم کے تصورِ فقر کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے تا کہ ان دونوں روحانی شخصیات کے نظریات کی بھرپور عکاسی ہو سکے۔

باب ہفتم میں گزشتہ چھ ابواب میں اٹھائے گئے نکات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ پاک کا احسان عظیم ہے کہ یہ مرحلہ میرے ماں باپ کی دعاؤں سے بخیر و خوبی طے ہوا اور مقالے کا تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا۔ یہ امر باعثِ صد افتخار ہے کہ اس تحقیقی کام کے دوران میں میرے نگرانِ تحقیق علم پرور اور اقبال شناس پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی صاحب کی شفقت اور رہنمائی ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ ان کا شکریہ کرنا میرا فرض اولین ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی رہنمائی بھی میرے کام آتی رہی۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران صاحب کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے حوصلہ افزائی کے طور پر اپنی ذاتی لائبریری سے قیمتی کتب دے کر ممنون فرمایا۔ شعبۂ اقبالیات میں ڈاکٹر محمد اکرم صاحب کی ذاتی ہمدردی اور رہنمائی کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر صاحب چیئرمین شعبۂ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی رہنمائی اور شفقت کا میں صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

برادرِ عزیز عبد الواجد تبسم صاحب لیکچرار شعبہ پاکستانی زبانیں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے پروف ریڈنگ اور کتب کی فراہمی کے علاوہ میری بھرپور اخلاقی مدد بھی کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب اور رشید احمد صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے میرے حوصلے بلند رکھے۔

میں اس اظہار تشکر میں اپنی رفیقہ حیات منور شاہین کا احسان مند ہوں کہ جنہوں نے ناسازیٔ طبع کے باوجود نہ صرف گھریلو معاملات کی بہترین دیکھ بھال کی بلکہ مقالہ کی تیاری میں بھی حوصلہ افزائی کی۔ اس ضمن میں اپنے پیارے بچوں ہما عزیز، سعدیہ عزیز، فرح عزیز اور محمد احسان الرحمٰن عزیز (صوفی خان) کا شکریہ ادا کرنا لازمی

ہے کہ جنہوں نے ہر قدم پر میرے حوصلے بلند رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

آخر میں ریاض احمد صاحب، نعیم الرحمٰن فاروقی صاحب اور محمد اسلم صدیق صاحب (ایاز بک بائینڈنگ شاپ) کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے دن رات ایک کر کے اس مقالے کی کمپوزنگ، سیٹنگ اور خوبصورت بائینڈنگ کی۔

اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ تحقیق کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ امید واثق ہے کہ اس مقالے کو اساتذہ کرام اور ارباب نظر قبولیت سے نوازیں گے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

مقالہ نگار

عزیز الرحمٰن عزیز

ریسرچ اسکالر ایم فل اقبالیات

رجسٹریشن نمبر: 98-PRI-6130

رول نمبر: H-7848313

راولپنڈی

10 فروری 2008ء

بمطابق 2 صفر المظفر 1429ھ

باب اوّل

فقر کی تعریف اور پس منظر
اسلامی تصوف میں فقر کا مقام

فقر کی ماہیّت :

فقر کے معنی بظاہر احتیاج کے ہیں اور فقیر وہ ہے جس کے پاس اسباب زندگی نہ ہوں، مفلس اور حاجت مند ہو۔ ارشاد ربانی ہے: شیطان تمہیں مفلسی، تنگدستی سے ڈراتا اور شرم کی بات یعنی بُخل کی جانب برانگیختہ کرتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے قصوروں کو معاف کرنے اور برکت عطا کرنے کا وعدہ فرماتا ہے:

> ''اصطلاح عام میں ''فقر'' سے بھیک مانگنا اور ''فقیر'' سے بھکاری مراد لیا جاتا ہے۔ رہبانیت پسند لوگوں کے یہاں یہ لفظ گوشہ گیری، عُزلت پسندی، سکون و جمود محتاجی و محرومی، غربت و افلاس اور عمل کے فقدان کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فقر کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے ''اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ'' (فقر میرے لیے فخر ہے) نہیں فرمایا تھا۔ یہ راہبانہ انداز سراسر تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دینِ اسلام کے منافی ہے۔''(1)

فقیر، عربی زبان کا یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو ضرورت مند یا حاجت مند ہوں۔ چاہے دنیاوی ضروریات کے نقطۂ نظر سے یا روحانی نقطہ نظر سے۔ فقیر اور مسکین میں یہ فرق ہے کہ فقیر تو صرف محتاج ہوتا ہے اور مسکین تباہ حال۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو غنی اور اس کے مقابلے میں انسان کو فقیر یعنی حاجت مند کہا ہے۔ شہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق:

> ''فقیر کو فارسی میں درویش کہتے ہیں۔ فقیر اور درویش، دونوں الفاظ اردو میں عام مستعمل ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں مانگنے والوں اور سائل کے لیے یہ لفظ مستعمل ہونے سے اس کا اصل مفہوم بدل گیا ہے۔ حالانکہ جس انداز میں یہ لفظ سورۂ فاطر میں اللہ نے استعمال کیا ہے کہ انسان تو اللہ سے مانگنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کا محتاج نہیں۔ نوعِ انسان بہرصورت فقیر ہے، چاہیے کہ وہ اللہ سے مانگے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں اور دوسروں سے کچھ طلب نہیں کرتے اُن کو متوکّل کہتے ہیں۔''(2)

فقر کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے:

۱۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا۔ اس اعتبار سے تمام انسان فقیر ہیں۔

''انتم الفقرا'' ''اے انسانو! تم سب اللہ کے فقیر (محتاج ہو)''۔

۲۔ ضروریات زندگی کا کما حقہ، پورا نہ ہونا۔

۳۔ فقر النفس یعنی مال کی ہوس۔ اسی لئے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ کا دالفقراء ان یکون کفرا۔ اندیشہ ہے کہ فقر کفر تک نہ پہنچا دے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج۔ جس کی عکاسی نبی کریمؐ کی اس دعا سے ہوسکتی ہے۔ ''اے اللہ تعالیٰ! مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا۔ نبی کریمؐ نے ایک اور دعا میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی: ''اے میرے اللہ! مجھے فقیری کی حالت میں زندہ رکھ۔۔۔

فقر غنا کی ضد میں بولا جاتا ہے۔ ''غنی'' خدا کا نام ہے اور وہی اس صفت کا سزاوار ہے۔ انسان تو پیدا ہی فقیر اور محتاج ہوا ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاطر کی آیت 15 میں کیا ہے۔ یہ دنیا ابتلا اور آزمائش کی جگہ ہے۔ اس لیے اگر یہاں غنا کی حالت ہو یا فقر کی، دونوں میں انسانوں (مسلمانوں) کے لیے آزمائش ہے۔ فقر کی حالت میں ضروری ہے کہ صبر کیا جائے، اور غنا کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔

میجر نقوی نے فقر کی تعریف کچھ اس انداز میں کی ہے:

> ''اہل تصوّف کے نزدیک فقر، فاقہ، قناعت اور ریاضت کا نام ہے۔ فاقہ سے مراد وہ تقویٰ ہے جو لذّاتِ دنیا کو مکروہ سمجھتا ہے جس میں اکل و مشرب کے تمام لطائف سے پرہیز نفس شکنی کے لیے ضروری ہے۔ جس میں دیو نفس کو زیر کرنے کے لیے جسم کو اتنا ناتواں کرنا ضروری ہے کہ اس میں طبعی خواہشات کمزور ہوتے ہوتے فوت ہو جائیں۔ قناعت، عزلت نشینی اور دار و گیر دنیا سے دست کشی کا نام ہے۔ ''ریاضت'' یادِ محبوب و مقصود کا وہ مشغلہ ہے کہ جس میں ڈوب کر سالک دنیا و مافیہا سے اپنے رشتے منقطع کر لیتا ہے۔ غرض فرد کا اپنے کو تر دامنی اور کثافت و آلائش نفس سے بچا کر ایک طرف بیٹھ کر حسن سرمدی سے لو لگانے کا نام فقر ہے۔''(3)

اسلامی تصوف کے برعکس اگر دیگر فلسفہ ہائے زندگی کو دیکھا جائے تو تمام رہبانی فلسفیوں کے نزدیک مثلاً گوتم بدھ۔۔۔خواہشات جنسی، جذبہ غضب اور ہوا و ہوس تمام گناہوں کا منبع ہیں۔اور انسان کو اپنی نجات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تیاگ اور رہبان سے گیان حاصل کر کے ان تینوں مفاسد العیوب سے محفوظ رہے۔ تیاگ ترک کر دینا اور رہبانیت کا نام ہے اور دیکھان اس طرح سر بزانو ہو کر فکر کرنے کا نام ہے کہ ساری دنیا اور اس کی چہل پہل کالعدم ہو جائے۔اور صرف یہی طریقہ ایسا ہے کہ انسان بے نیازی حاصل کرتا ہے۔اور رموزِ کائنات اس پر منکشف ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس طریقہ پر چلتے ہیں، وہ بھکش یا فقیر کہلاتے ہیں۔''عزلت و کم آمیزی اور خصوصاً اسے ثواب یا تقویٰ و فضیلت سمجھ کر اختیار کرنا رہبانیت کی ایک خفی علامت ہے۔''(4)

> ''ایک خاص غلط قسم کا توکّل دراصل خفی و جلی رہبانیت کی خطرناک علامت ہے۔توکّل کے رہبانی مفہوم کو دل میں بٹھا لیا جاتا اور اسباب و وسائل اور محنت و کسب کو ترک کر دیا جاتا ہے رہبانی توکّل کی کسی صورت میں بھی اسلامی توکّل میں کوئی گنجائش اور مقام و مرتبہ نہیں ہے۔''(5)

جہاں تک فقر و استغنا کے اسلامی تصور کا تعلق ہے تو فقر کے لغوی معنی افلاس اور ناداری کے ہیں۔لیکن تصوّف کی اصطلاح میں توکّل اور قناعت کو فقر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔سرور کائنات فخر موجودات نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک ہے:(اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ) ''فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے''

حضرت جنیدؒ بغدادی فرماتے ہیں:

> ''فقر کے تین حرف ہیں: ف، ق، ر۔''ف'' سے فنا اور فارغ خاطر، ''ق'' سے قناعت اور ''ر'' سے ریاضت کے الفاظ بنتے ہیں۔جو فقر کا خلاصہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا کو فنا کر دینا، غیر اللہ سے اپنے دل سے فارغ کر لینا، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس پر قناعت کرنا اور اللہ کے راستے میں ریاضت کرنا یعنی مشقتیں برداشت کرنے کا نام فقر ہے۔''(6)
>
> ''حضور ﷺ نے ساری زندگی دولت جمع نہیں کی۔جو کچھ آپؐ کے پاس آتا غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: کئی کئی دن ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔خیبر اور دوسرے علاقے فتح ہوئے تو مسلمانوں کی حالت بھی بہتر ہوگئی۔مگر حضور ﷺ نے اسی حالت کو پسند کیا کہ کچھ ملا تو اسے تقسیم کر دیا

اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور نہ ملا تو صبر کیا۔ گھر میں کچھ ہوتا تو کھا لیتے، نہ ہوتا تو روزے کی نیت کر لیتے اور کئی کئی دن اسی حالت میں گزار دیتے'' (7)

اسلامی تعلیمات کے ان دونوں ماخذوں میں فقر کو ناداری کے معنوں میں نہیں بلکہ قناعت اور توکّل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو افلاس کے باعث انسان کو بھوک اور ننگ کا شکار بناتا ہے۔ اسلام اس کے خلاف جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ اور فقر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان دنیاوی دولت حاصل ہونے کے باوجود اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ اسے اپنی زندگی پر مسلط نہیں کرتا اور اس کی ہوس کو دل میں جاگزیں نہیں ہونے دیتا۔ یہی فقر ہے جو روح کو بالیدگی اور ذہن کو توانائی عطا کرتا ہے۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی فقر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''طریقت میں فقر کے معنی محتاجی و مفلسی کے نہیں ہیں۔ صوفی فقیر جاہ و مال، عزت، منصب، سوال، ناداری سب کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ ان سب اعتبارات سے مافوق ہوتا ہے۔ اس کی ہمت ان سب چیزوں سے بالا و برتر ہوتی ہے۔ وہ غیر کا احسان ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں میں جب سے یہ دُنیوی فقر و احتیاج اور حُبّ جاہ و مال آئی، اُسی وقت سے ان کا زوال شروع ہو گیا۔'' (8)

اسلام فقر میں پیدا ہوا، فقیری کی گود میں پلا بڑھا، اور فقیری نے ہی اس کو سلطانی و شہنشاہی بخشی۔ یہ فقر ہمارے اس ظاہری فقر سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ بندہ مومن جب فقیری کے اس راز سے واقف ہو جاتا ہے، تو دنیا اور اس کی سب جاہ و حشمت خود اس کے قدموں میں لوٹتی نظر آتی ہے۔ ناداری سے اس فقیری میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فقر جو توحید کا راز داں ہے اور متاعِ محمدیؐ کا امین ہے اور جس کی بنیاد قرآن عظیم کے بنیادی عناصر، صدق، اخلاص، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا ہیں یہی حقیقت میں فقر اسلامی کا بنیادی مقصد ہے، اسی پر حضورؐ نے فخر کیا تھا جب سے مسلمانوں نے یہ فقر کھو دیا، دین بھی اُن کا نہ رہا اور دنیا نے بھی اُن سے مُنہ موڑ لیا۔

جہاں تک فقرِ دین و دنیا کا تعلق ہے اقبال کے درج ذیل اشعار سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اِک فقر سے کُھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اِک فقر ہے شبیریؓ ، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیریؓ (9)

اس اسلامی فقر پر جس کا ظاہر غربت ہو اور باطن اسلامی روح، مسلمانون کو ہمیشہ فخر رہا ہے اور کبھی یہ امر اس کی کمزوری کا باعث نہیں بن سکا۔ ''اصطلاح عام میں ''فقر'' سے بھیک مانگنا اور فقیر سے بھکاری مراد لیا جاتا ہے۔ رہبانیت پسند لوگوں کے یہاں یہ لفظ گوشہ گیری، عُزلت پسندی، سکون و جمود، محتاجی و محرومی، غربت و افلاس اور غم کے فقدان کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فقر کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے ''اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ'' (فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے) نہیں فرمایا تھا۔ یہ راہبانہ انداز سراسر تعلیماتِ نبوی ﷺ اور دینِ اسلام کے منافی ہے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لفظ فقر کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الفقر کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا، اس اعتبار سے انسان کیا کائنات کی ہر شے فقیر و محتاج ہے۔ چنانچہ انہی معنوں میں فرمایا گیا:

> ''اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج (فقیر) ہو'' پھر فرمایا صدقہ و خیرات تو مفلسوں اور محتاجوں کا حق ہے۔ فقر کا مقابل لفظ غنیٰ ہے اور سیّد عالم ﷺ کے ارشاد کے مطابق غنیٰ نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ انہی معنوں میں حکماء نے کہا ہے ''جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہو اسے مالداری کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ حضور ﷺ نے فقیر الیٰ اللہ کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: ''اے اللہ مجھے اپنا فقیر و محتاج بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا۔'' فقیر دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ عربی کا ایک محاورہ ہے فقرته فاقرة یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی ہے۔''(10)

سورۃ محمد ﷺ کی آخری آیت میں رب العزت کا ارشاد ہے ''اور اللہ تو غنی ہے۔ کسی کا محتاج نہیں اور تم محتاج و فقیر ہو۔

اسی آیت کریمہ کی روشنی میں حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک دلکش اور جاں نواز رباعی کہی تھی:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

(اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ارمغان حجاز، ص:18)

مذکورہ بالا آیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو حضور سیّد عالم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ اول تا آخر فقر کی تفسیر ہے اور بمنزلہ اس مصدر کے ہے جہاں سے چشمۂ فقر پھوٹا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمِ کون ومکاں میں وہ ہستی ہیں جو بیک وقت فقیر بھی ہیں اور شہنشاہ بھی۔ آپ کا فقر اختیاری، شہنشاہی کی زینت اور شہنشاہی کی قوت ہے۔ بقولِ اقبال:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ
ایں تجلّی ہائے ذاتِ مصطفیٰؐ
ایں دو قوت از وجودِ مومن است
ایں قیام و آں سجودِ مومن است
فقر، شوق و تسلیم و رضا
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ (11)

''حدیثِ قدسی میں ہے ''لی خرقتان. الفقر و الجهاد''. میرے دو خرقے ہیں ''فقر اور جہاد'' نیز ایک اور مشہور ارشاد بھی ''الفقر فخری'' ہے سرکار دو عالم ﷺ اس عالمِ فانی میں اپنے اسوۂ حسنہ سے انہی ارشادات کی شرح فرماتے رہے۔ اور رفیقِ اعلیٰ سے ملتے وقت سب سے عظیم ترکہ جو امت کے لیے چھوڑا وہ یہی فقر تھا۔ پھر وہ عالی نہاد، بندگانِ مولیٰ صفات جو اس ترکہ کے وارث وامین ہوئے، شاہانِ شرق وغرب اُن کے آگے جھکے اور زمین نے اپنے پوشیدہ خزانے ان کے قدموں میں اس لیے نچھاور

کیے کہ وہ زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کریں، ستم رسیدوں کی یاد آوری کو آئیں، محروموں کو ان کا حق دلائیں اور خدا کی دی ہوئی دولت اس کے بندوں میں اس طرح تقسیم کرتے چلے جائیں کہ عدل ان کا چاؤش اور امانت ان کی نقیب ہو۔۔۔ خشیت اللہ، ماسوا اللہ کے خوف سے رستگاری، ترکِ حرص و آز یقیناً وہ عناصر ہیں جن کے بغیر فقر کی تکمیل نہیں ہوتی۔''(12)

فقر کے بارے میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا کہ ''فقیر کی شان کے شایان یہ ہے کہ وہ اپنے فقر سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کوئی دولت منداپنی دولت سے کرتا ہے۔''

جہاں تک فقیر کا تعلق ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ خدا سے یہ درخواست نہ کرے کہ میرا فقر تونگری سے بدل جائے اور تونگری کے اسباب اور مال کی زیادتی اور اپنے عیال و اطفال کی معاش حاصل کرنے کے واسطے کسب اور حرفت میں کوشش نہ کرے۔ اس میں اپنے آپ کو تکلیف نہ دے اور نہ ہی اس خیال سے کسب اور حرفت میں کوشش کرے کہ وہ پارسائی میں تنگی کے وقت میرے کام آئے گا۔ فقیری کی یہ شرط بیان کی گئی ہے کہ اس مقدار پر ہی قناعت کرے جو اس کے واسطے کافی ہو۔ اس سے کسی حال میں زیادہ طلب نہ کرے اور خدا کے حکم کے موافق اس بات کا خوف کرے کہ میرا نفس گناہ میں گرفتار ہو کر ہلاک نہ ہو جائے۔ اپنے نفس پر رحم کرے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے (اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔ خدا تعالیٰ تمہارے اوپر رحمت کرنے والا ہے)۔ فقیر اپنے فقر کی لذت کو زیادہ جانے اور خودی اور گمنامی اور انکساری کو بہت زیادہ پسند کرے اور اس بات کو اچھا نہ جانے کہ لوگ اس کو قبول کریں اور اس کی طرف قصد کریں اور اس کے پاس جمع ہوں۔

فقیر کا دل حال کی صفائی کے سبب سے مال کے نہ ہونے کی حالت میں زیادہ قوی ہو کیونکہ جس قدر مال کم ہوگا اس کے دل کی خوشی اور طاقت اور نور بڑھ جائے گا اور نیک لوگوں کے شعار میں اس کو خوشی زیادہ ہوگی۔ فقیر کو لازم ہے کہ جس قدر اس کا عیال زیادہ ہو اسی قدر رزق کے کام میں اس کا دل زیادہ آرام پکڑنے والا اور اپنے اللہ پر زیادہ بھروسہ کرنے والا اور عیال کے واسطے کسبِ معاشی کے متعلق بجالانے میں بظاہر کوشش کرے اور خدا کے وعدوں پر باطن میں آرام پکڑے اور یقین کرے کہ خدا تعالیٰ کے پاس ان کا رزق موجود ہے۔

فقیر کو لازم ہے کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ان سے خوش خوئی اختیار کرے۔ ترش رو نہ رہے۔ فقیر کو چاہیے کہ مریضوں کی عیادت کو جائے اور بیمار پُرسی کرے۔ حریص اور خدا سے غافل ہو کر کھانا نہ کھائے۔ اس وقت اپنے دل میں خدا کو یاد کرے اپنے اہل اور فرزندوں سے نیک خُلق رکھے اور جیسے شرع میں حکم ہے اس کے موافق اس کے نان اور نفقہ کی خبر گیری کرتا رہے۔ پہلے عیال کو کھلائے اور آپ بعد میں کھائے۔

فقیر کو چاہیے کہ اگر کہیں اس کو لوگوں میں کوئی مرتبہ ملے اور قبولیت کا درجہ پالے تو اس جگہ سے نکل بھاگ جائے اور یہ اندیشہ کرے کہ لوگوں کی قبولیت کے سبب سے خدا کی درگاہ میں محجوب نہ ہو جاؤں۔ فقیر سفر میں بے ریش لوگوں کی صحبت اختیار نہ کرے۔ اور جب کسی شہر میں وارد ہو تو اس میں کوئی شیخ صاحب رہتے ہوں تو لازم ہے کہ اس کو پہلے سلام کرے اور اس کی خدمت کرے اور ان کی حرمت اور عزت نگاہ رکھے اور تعظیم بجالائے۔

شیخ عبدالقادر کے مطابق:

''فقیر سفر میں ہمیشہ باطہارت رہے۔ اگر پانی میسر نہ آئے تو تیمّم کرلیا کرے جیسا کہ اس کو وطن میں پاک رہنا مستحب ہے۔ اسی طرح اس کو سفر میں طہارت سے رہنا مستحب ہے۔ وضو مومن کا ہتھیار ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور شیاطین اور ہر ایک موذی سے وضو انسان کو امان میں رکھتا ہے۔''(13)

حسن رضوی کے مطابق فقیر میں درج ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے:

''سرور کائنات کا ارشاد ہے ''الفقر فخری'' یعنی مجھے اپنی فقیری پر ناز ہے آخر یہ کون سی فقیری ہے جس پر ختمی مرتبت ﷺ ناز کر رہے تھے۔ اس فقیری کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم سے بصیرت حاصل کی جاسکتی ہے۔۔۔ فقر ایک مومن کے سر کا تاج ہے اور اس کی معراج ہے۔ اس کے بغیر ایک سچے اور کھرے مسلمان کا تصور بے معنی ہے۔ دیکھا جائے تو ایک کلمہ گو کی تعلیم کا پہلا زینہ یہی ہے۔ یہی وہ زینہ ہے جس سے شہر مدینہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ جہاں مومن کی سیرت کو اجالتا ہے وہاں اس کی بصیرت میں بھی وسعت پیدا کرتا ہے۔ صاحبِ فقر وہ ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہے۔ جب کسی مسلمان میں فقر کی شان پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، اس کی گفتار اللہ کی گفتار اور اس کے ارادے اللہ کے ارادوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔''(14)

فقر درحقیقت خودی کا ایک ذیلی اخلاقی وصف ہے۔اس کا اشارہ ہرگز مفلسی،فقیری یا گداگری کے مفہوم کی طرف نہیں ہوتا۔فقر کے معنی یہ ہیں کہ دل کو دنیا سے الگ رکھنا، باہمہ و بے ہمہ رضا۔ دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا۔ دنیا میں سوائے سوزِ دل کے کسی چیز کی طلب نہ رکھنا۔انسان خواہ کتنے ہی اعلیٰ مناصب و مراتب پر کیوں نہ پہنچ جائے ،لیکن دل درویش رہنا چاہیے اور اسے اپنے فقر پر ناز ہونا چاہیے۔کیونکہ یہی درویش کی عظمت کی نشانی ہے۔صاحبِ فقر،عیش و آرام کی تمنا نہیں کرتا بلکہ وہ ہر وقت طوفانوں سے ٹکراتا اور موج بلا خیز سے نبرد آزما ہوتا ہے۔تا کہ روح و بدن کی بالیدگی کا سلسلہ برقرار رہے اور اس کی خودی تیز تر ہو جائے۔

فقر کے دو حصّے ہیں ایک ظاہر جس کی اساس مفلسی اور بیچارگی ہے۔دوسرا حصّہ حقیقت کا ہے جو اقبال و اختیار پر مبنی ہے۔جس نے ظاہری صورت پر اکتفا کیا اسے کوئی نفع حاصل نہ ہوا اور جس نے حقیقت حاصل کر لی وہ موجودات سے رُوگردان ہوا اور تمام ماسوئی کی نفی کرتا ہوا دیدارِ کُلی کی نعمت سے ہمہ تن گوش ہوا۔اصل میں فقیر وہ ہے جسے کسی چیز کے نہ تو کھو جانے کا غم اور نہ ہی حاصل ہونے سے غیر معمولی خوشی حاصل ہو۔اس کی نگاہِ فقر میں دنیا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں تصوّف کے حصول کے لیے علم کا چشمہ ضروری ہے تا کہ اس کے پانی سے تصوّف کی جڑ مضبوط اور شاخ میوہ دار ہو۔اسلامی تصوّف کی تعلیمات کی تشریح و توضیح کے کام کو اپنے ذمہ لیتے ہوئے آپ نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کیا۔کسی خاص مسئلہ پر رائے زنی سے پہلے آپ نے رائج الوقت خیالات کا جائزہ لیا اور بشرط ضرورت ان کی تردید کا حق ادا کیا۔ایک رواں اور غیر رسمی انداز بیاں اختیار کرتے ہوئے آپ نے ذاتی تجربات سے اخذ کردہ دلچسپ حکایات اور تمثیلات سے کام لیا جس سے ایک دقیق اور اختلافی موضوع نے ایک دلآویز ادب پارہ کی صورت اختیار کر لی۔

حضرت علی دینوریؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''بیکار چیزوں کو ترک کرنا تصوّف ہے۔حضرت ابوعلی احمد بن محمد رودباریؒ کا قول ہے کہ ''اُون کا لباس پہننا،نفس پر جبر کرنا،دنیا ترک کرنا اور سُنت مطّہرہ کی پیروی کرنا تصوّف ہے۔'' اسی طرح ابوسلیمان دارانیؒ کے مطابق تصوّف اس کو کہتے ہیں کہ تمام تکالیف کو منجانب اللہ سمجھ کر صبر کرے اور ماسوائے اللہ کو ترک کر دے۔''(15)

حقیقتاً صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں سُنتِ رسول مقبول ﷺ ہو۔نیز صوفی وہ بھی ہے جس کی گفتار و کردار میں فرق نہ ہو۔جو اخلاق کی تہذیب کا کام کرے۔

صوفیائے کرام نے درج ذیل دس مقامات کو چُن لیا جو فقر کے لیے لازم ملزوم ہیں۔

۱) توبہ ۲) زہد ۳) توکل ۴) صبر ۵) شکر

۶) خوف ۷) رجا ۸) رضا ۹) قناعت ۱۰) فقر

فقر و درویشی کی فضیلت قرآن و حدیث و اقوال بزرگان کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں کچھ مہاجر مسجد نبوی میں رہ کر عبادت ہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ حضور ﷺ انہیں بہت چاہتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے حکم پر صحابہ ؓ ان لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ داتا صاحبؒ کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ کسی چیز کا اسے نقصان ہو۔ وہ نہ اسباب دنیوی کے موجود ہونے پر غنی ہوتا ہے اور نہ غیر موجود ہونے ہی سے ان کا محتاج رہتا ہے۔ اس فقر کا مطلب کسی صورت میں صرف مفلسی نہیں ہے۔ فقر ایسی نعمت ہے جو حضور اکرم ﷺ کے لیے باعثِ فخر تھا۔ صوفیوں میں فقر کے موضوع پر بڑا دلچسپ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض صوفی فقر کے خلاف اور غنا کے حق میں ہیں۔ داتا صاحبؒ کا خیال ہے کہ حقیقت میں غنی صرف خدا ہی ہو سکتا ہے۔ صوفیہ نے فقر کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا ہے: فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے بھی غنی نہیں ہوتا۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ کے خیال میں فقیر کا وصف یہ ہے کہ وہ جب کوئی چیز نہ پائے تو خاموش رہے اور جب پائے تو دوسروں پر خرچ کر دے۔ شبلیؒ ہی نے کہا ہے کہ فقر مصیبت کا سمندر ہے اور اس کی تمام مصیبتیں عزت ہیں ـــــ لیکن فقر کی ایک رسم ہے اور ایک حقیقت ہے، اس کی ظاہری رسم مفلسی اور اضطراری ہے۔ اس کی حقیقت ذاتِ حق کی طرف توجہ اور معرفت ہے ـــــ پس فقیر وہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور اس کا کسی چیز میں نقصان نہ ہو۔ وہ اسباب کے ہونے سے بے نیاز اور نہ ہونے سے محتاج نہ ہو۔ اسباب کا ہونا یا نہ ہونا اس کے فقر کے قریب برابر ہوتا ہے۔ اگر وہ اسباب کے نہ ہونے سے زیادہ خوش ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ مشائخ نے کیا خوب کہا ہے کہ فقر جتنا تنگ دست ہوگا اس کا حال اتنا ہی کشادہ ہوگا، کیونکہ اسباب کا ہونا درویش کے لیے بہت بُرا ہے۔

> ''۔۔۔ یہ دنیا بے وفاؤں اور بدکاروں کا گھر ہے۔ غرض دنیاوی اسباب رضائے الٰہی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔۔۔ مخلوقات کی صفات فقر و غنا کی فضیلت کے بارے میں مشائخ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان دونوں صفتوں میں کون سی صفت زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ چونکہ حقیقی معنوں میں غنی خداوند تعالیٰ ہی ہے اور صفات میں کمال اسی کو حاصل ہے۔۔۔ غنا کا نام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے سزاوار ہے اور مخلوق اس نام کی حقدار نہیں ہے اور فقر کا نام مخلوق کے لیے ہے'' (16)

مندرجہ بالا قرآن واحادیث کے حوالوں اور صوفیائے کرام کے اقوال سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ فقر سے مراد وہ فقیری نہیں جو انسان کو دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اس کی انا کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ اس سے مراد بھیک مانگنا نہیں بلکہ دو جہاں کی دولت ہونے کے باوجود استغنا کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہی وہ فقر ہے جس پر حضور پاکؐ نے فخر کیا ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ فقیر کا طرز عمل بھی اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس کی بظاہر پہچان نہیں کی جا سکتی۔ وہ فنا فی اللہ ہو کر اپنی ذات وصفات سے فارغ ہوتا ہے، یادِ الٰہی سے اپنے دل کو قوت دیتا ہے، امید الٰہی پر قائم رہتا ہے اور ہر وقت رجوع الی اللہ رہتا ہے۔

تصوّف کی ابتدا آج سے چودہ سو سال قبل ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی ہوئی تھی جب اسلام مکمل ضابطۂ حیات ٹھہرا۔ احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ خود سراپا تصوّف اختر ہے۔ آپ ﷺ وجہِ تخلیق کائنات بھی ہیں اور نبی آخر الزمان ﷺ بھی، محبوب خدا بھی اور اسلامی سلطنت کے منتظم ونگرانِ اعلیٰ بھی تھے۔ مگر پھر ''بوریا نشین'' تھے آخر کیوں؟

اس لیے کہ آپ کا پیغام صرف اور صرف توحید الٰہی کی سربلندی اور انسانیت کو درسِ عظیم دینا تھا نہ کہ ذاتی نمود ونمائش مقصود تھی۔ حیاتِ نبوی ﷺ کا یہی پہلو ''تصوف'' تھا۔ آپ ﷺ کے زیر سایہ اسلامی سلطنت میں فوج، عدلیہ، انتظامیہ اور خزانہ (بیت المال) کے شعبے موجود تھے۔ نیز تجارت وزراعت بھی اپنے عروج پر تھی۔ تمام مسلمان اپنے اپنے شعبہ جات میں مصروف عمل تھے۔ لیکن ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان تمام معاملات سے الگ تھلگ تھا۔ ان کا مقصود صرف اور صرف قُربِ الٰہی اور حُبِ رسول اللہ ﷺ تھا۔ اور وہ تھے ''اصحاب صُفّہ'' یہ حضرات مسجد نبوی ﷺ کے مستقل مہمان تھے۔ یہ دبلے پتلے لوگ دنیا ومافیہا سے بے نیاز بحرِ عشق رسالت مآب ﷺ میں اس قدر ڈوب چکے تھے کہ انہیں دنیاوی آسائشوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی کے واسطے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا:

''مت نکال ان لوگوں کو جو رات دن اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں محض اس کی رضا مندی سے۔''

پھر خود رسول کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں تم کو خوشخبری ہو۔ اور تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے۔ اور تمہاری سی حالت ہوگی۔ ان کو بشارت ہو کہ وہ بھی اپنے فقر پر راضی ہوں گے اور تم سب میرے رفیقوں میں سے ہو۔

تصوّف کا نام دوسری ہجری سے قبل اہل عرب میں مشہور و معروف ہو گیا تھا۔ تصوف کا لفظ بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اہلِ تصوّف کے اسلاف اکابر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے معنی ہوں گے ''صفائی باطن کرنے والے''!

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے دعا مانگی کہ یا اللہ جو شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے اسے گزارہ کے موافق رزق عطا فرما جو اُسے سوال سے محفوظ رکھے اور جو شخص مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اسے مال و اولاد میں خوب کثرت اور فراوانی عطا فرما۔ حضور پاک ﷺ کا یہ بھی ارشاد پاک ہے کہ فقر دنیا میں مشقت اور آخرت میں مسرت ہے اور غنا دنیا کی مسرت اور آخرت کی مشقت ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی پیشہ ہوتا ہے اور میرے دو پیشے ہیں۔ ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ جو اُن کو پسند رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو اُن دونوں کو بُرا جانتا ہے وہ مجھ سے بُغض رکھتا ہے۔

فقیہؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو چاہیے کہ فقرا سے محبت رکھے۔ اگر چہ خود غنی ہو۔ کیونکہ فقرا کی محبت رسول اللہ کی محبت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود اپنے رسول اللہ کو فقراء سے محبت کا امر فرمایا اور ان کی ہم نشینی کا حکم دیا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہم بعض دفعہ کوئی چیز دیکھتے ہیں مگر رغبت کے باوجود اسے خرید نہیں سکتے۔ کیا ہمیں اس میں کچھ اجر ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں بھی نہ ملا تو پھر کس میں ملے گا۔

حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بازار میں گیا۔ وہاں پر اپنی مرغوب اور پسندیدہ چیزیں پڑی دیکھیں مگر لے نہیں سکتا، صبر کیا اور اس پر ثواب کی نیت کی تو یہ اس کے لیے ایسے لاکھ دیناروں سے بہتر ہے جنہیں وہ اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کر دے۔

فقیہؒ فرماتے ہیں کہ فقراء کی فضیلت کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس پاک ارشاد میں ہے:

''کہ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کیا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (النور:56)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب فقرا ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو انبیاء علیہ السلام تمام مخلوق سے زیادہ محبوب ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان

حضرات کو حالتِ فقر میں رکھا ہے۔

''فقیہ ابواللیث اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن حارثؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص آخرت کی نیت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پریشانیوں کو دور فرماتے ہیں۔ اس کے دل کو غنا سے بھر دیتے ہیں اور دنیا اُس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔ اور جو شخص دنیا کی نیت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پریشانیاں بڑھاتے ہیں۔ اس کا فقر اس کی نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں اور دنیا اس کو اتنی ہی ملتی ہے جو اُس کے لیے رکھ دی گئی ہے۔ حضرت جندبؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ ایک چٹائی پر تھے پہلوئے مبارک پر چٹائی کے نشان دیکھ کر رونے لگے۔ حضور ﷺ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ مجھے قیصر و کسریٰ اور ان کے سامانِ آسائش یاد آنے لگے اور آپ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں اور حال یہ ہے کہ پہلو مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کو اُن کے حصہ کی نعمتیں دنیا میں ہی دے دی گئی ہیں اور ہمارے حصہ کی نعمتیں آخرت کے لیے محفوظ ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے تم پر صرف دو باتوں کا خطرہ ہے، لمبی امیدیں اور خواہشات کی اتباع۔ لمبی امیدیں آخرت کو بھلاتی ہیں اور خواہشات کی اتباع حق سے روکتی ہے اور دنیا پشت پھیر کر کوچ کر چکی ہے۔ اور آخرت آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے اور ان دونوں میں ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ ہیں سو تم آخرت والے بنو، دنیا والے مت بنو کہ آج عمل ہے حساب نہیں اور کل حساب ہوگا عمل نہیں ہوگا۔ مطلب یہ کہ آج خوب عمل کر لو، کل تمہیں عمل کی فرصت نہیں ملے گی۔'' (17)

حاصل یہ کہ نماز میرے لیے قائم کرو اور زکوٰۃ فقرا کو ادا کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فقراء کے حق کو اپنے حق کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔

مشہور مقولہ ہے کہ فقیر آدمی غنی آدمی کا طبیب ہے، اس کا دھوبی ہے، اس کا قاصد ہے، اس کا نگران ہے، اس کا سفارشی ہے۔

۱۔ طبیب تو اس لیے کہ غنی جب صدقہ کرتا ہے تو فقیر اس کے لیے دعا کرتا ہے۔ جس سے وہ خود بھی گناہوں کی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے، اس کا مال بھی پاک ہو جاتا ہے۔

۲۔ قاصد اس طرح کہ غنی اپنے والدین کی طرف سے یا کسی رشتہ دار کی طرف صدقہ کرتا ہے تو اس کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے۔ تو گویا فقیر مردہ تک ثواب پہنچانے میں واسطہ اور قاصد بن گیا۔

۳۔ نگران اس طرح کہ صدقہ کرنے پر فقیر غنی کے مال کی حفاظت کی دعا کرتا ہے اور اس کی دعا کی برکت سے اس کے مال کی حفاظت ہوتی ہے۔

> ''آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں جنت کے بادشاہوں کی خبر نہ دوں۔ عرض کیا گیا کہ ضرور ارشاد فرمایئے۔ ارشاد فرمایا جنت کے بادشاہ وہ مظلوم اور ضعفا لوگ ہیں جو ناز و نعمت والیوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کی حاجات کے دروازے کھلتے ہیں اور اپنی حاجتوں کو سینے میں لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں تو وہ اسے پورا کر دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو غنا کی وجہ سے کسی کی عزت کرتا ہے اور فقر کی وجہ سے توہین کرتا ہے۔''(18)

حضرت ابو درداؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے غنی بھائی ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ وہ کھاتے ہیں ہم بھی کھاتے ہیں۔ وہ پیتے ہیں ہم بھی پیتے ہیں۔ وہ پہنتے ہیں ہم بھی پہنتے ہیں۔ ان کے پاس کچھ زائد مال ہیں جنہیں وہ دیکھتے ہیں ہم بھی دیکھ لیتے ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا حساب ہوگا اور ہم اس سے بری ہوں گے۔

شفیق زاہدؒ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں فقراء نے اختیار کی ہیں اور تین اغنیا نے۔ فقرا نے نفس کی راحت، دل کا فراخ اور حساب کا ہلکا ہونا اختیار کیا ہے اور اغنیا نے نفس کی مشقت، دل کے الجھاؤ اور حساب کی سختی برداشت کی ہے۔

جو شخص چار چیزوں کا چار چیزوں کے بغیر دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ وہ شخص جو اپنے مولا کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے حرام سے نہیں بچتا۔ دوسرا وہ شخص جو جنت کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال خرچ نہیں کرتا۔ تیسرا وہ جو رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے مگر سنت کی اتباع نہیں کرتا۔ چوتھا وہ شخص جو اعلیٰ درجات کی محبت کا دعویدار ہے مگر فقرا اور مساکین سے ہم نشینی نہیں رکھتا۔

> ''حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ اے لوگو تنگ دستی اور فاقہ مندی تمہیں تلاشِ رزق

میں ناجائز ذرائع پر نہ لگا دے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ اے اللہ مجھے وفات فقیری میں ہوتونگری میں نہ ہواور قیامت کے دن میرا حشر مساکین کے ساتھ ہو کیونکہ سب سے بڑا بد بخت وہ ہے جس پر دنیا کا فقر اور آخرت کا عذاب دونوں جمع ہو گئے۔''(19)

مندرجہ بالا احادیث اس بات کی شاہد ہیں کہ اسلامی تصوف میں فقر کو کس درجہ بلند مقام حاصل ہے۔ حقیقت میں فقر بظاہر دنیا کی مشقت نظر آتی ہے تاہم بقولِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخرت میں مسرت کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان فقرا کو پسند کرتا ہے کہ جو دنیاوی خواہشوں کے متحمل ہونے کے باوجود قناعت سے کام لیتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال حضورؐ کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ دو جہانوں کے بادشاہ کی یہ حالت ہے کہ بان کی کھردری چارپائی سے جسم اقدس پر نشانات پڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ آقائے دو جہاں ہیں کہ جن کے کئی کئی دن فقر و فاقہ میں گزر جاتے ہیں۔ تاہم جو لوگ حرص و ہوس کے دلدادہ ہیں اور دنیا ہی کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا:

''اہل دنیا کی حسرت بڑھانے کیلئے دنیا کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ فقیہؒ فرماتے ہیں کہ دنیا کو تو وہاں پر کوئی عذاب نہ ہوگا کیونکہ اس کا تو کوئی گناہ ہی نہیں، اسے تو آگ میں اس لیے ڈالا جائے گا تاکہ اس کے چاہنے والے اس کو دیکھیں اور اس کی ذلت اور رسوائی کا مشاہدہ کرلیں۔''(20)

تاریخِ اسلامی شاہد ہے کہ صوفیائے کرام نے ملتِ اسلامیہ میں نئی روح پھونکی۔ زوال کے بدترین دور میں بھی احیائے دین کے نئے راستے تلاش کیے اور مسلمانوں کو راستی اور سماجی زندگی گزارنے کے ہُنر سکھائے۔ یہ اُن کی تعلیم و تربیت کا ہی لازوال صلہ تھا جس کی بنا پر جاہلیت کے اندھیرے چھٹ گئے۔ انہوں نے بصیرت اور حکمت کے ساتھ نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلامی معاشرے کو صحیح مزاج میں ڈھالنے کے لیے انتھک تگ و دو کی۔

حواشی وحوالہ جات

1- الیس۔ایم منہاج الدین، ڈاکٹر، افکار وتصوّرات اقبال، حصہ اوّل (ملتان، کاروان ادب، 1985ء، ص:133)

2- قاسم محمود، سید، مرتب، شاہ کار اسلامی انسائیکلو پیڈیا (لاہور، الفیصل ناشران، ص:1251)

3- الیس۔ ایم۔ وائی۔ نقوی، میجر، مضمون مشمولہ اقبال کا نظریہ فقر (راولپنڈی، ماہ نامہ فیض الاسلام، اکتوبر 1949ء، ص:27)

4- رہبانیت صغریٰ، اقتباسات (راولپنڈی ماہنامہ فیض الاسلام، اکتوبر 1949ء، ص:41)

5- رہبانی توکّل پر ایک نظر، اقتباسات (راولپنڈی، ماہ نامہ فیض الاسلام، اکتوبر 1949ء، ص:44)

6- شفیق الرحمٰن، سید، پروفیسر، اقبال کا تصور دین (لاہور، فیروز سنز، 1987ء، ص:114)

7- شفیق الرحمٰن، سید، پروفیسر، اقبال کا تصور دین (ص:14، 15)

8- محمد طاہر فاروقی، پروفیسر، سیرتِ اقبال، (لاہور، گوہر پبلی کیشنز، 2004ء، ص:328)

9- محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) بالِ جبریل (فقر)، (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت دوم، 1994ء، ص:490)

10- بشیر حسین، ناظم، شاعرِ مشرق اور تصور فقر، (ماخوذ)، (راولپنڈی/ اسلام آباد، روزنامہ نوائے وقت، جمعۃ المبارک 5 جولائی 2002ء، ص: ملّی ایڈیشن)

11- کلیات اقبال، فارسی، مثنوی مسافر (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1990ء، ص:55)

12- بشیر حسین، ناظم، شاعرِ مشرق اور تصور فقر، (راولپنڈی/ اسلام آباد، روزنامہ نوائے وقت، ص: ملّی ایڈیشن)

13- عبدالقادر جیلانی، شیخ، (غُنیۃ الطالبین) اُردو ترجمہ مولانا احمد صاحب مدراسی (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، 2000ء، ص:630)

14- حسن رضوی (مرتب) اقبال کے فکری آئینے (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1990ء، ص:224)

15- غلام سرور، رانا، پروفیسر، (فقر وتصوف، (راولپنڈی/ اسلام آباد، نوائے وقت، 29 مارچ 2005ء، سپیشل ایڈیشن)

16- محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر، مترجم۔ کشف المحجوب ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز 2007ء، ص:38، 37)

17- ادارتی (ایڈیٹوریل) صفحہ، آدابِ زندگی، (اسلام آباد/ راولپنڈی، روزنامہ جناح، 17 نومبر 2007ء، ص: آدابِ زندگی)

18- ایڈیٹوریل (ادارتی صفحہ) آدابِ زندگی، (اسلام آباد/ راولپنڈی، روزنامہ جناح، 14 نومبر 2007ء، ص: آدابِ زندگی)

19- ایضاً، (14 نومبر 2007ء، ص: آدابِ زندگی،)

20- ایضاً (ص: آدابِ زندگی، 23 نومبر 2007ء، ص: ادارتی صفحہ، آدابِ زندگی)

باب دوم

علامہ اقبالؒ کا مطالعۂ اسلام، تاریخ اور فلسفہ پر عمیق نظر

فکرِ اقبال کی اسلامی اساس:

اقبال کی شخصیت پر قرآن مجید جس قدر اثر انداز ہوا ہے اتنا وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ اقبال کا ایمان چونکہ نومسلم کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر نہیں ملا ہے، اس لیے ان کے اندر مسلکی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعے کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ اقبال کا قرآن پڑھنا عام لوگوں کے پڑھنے سے بہت مختلف رہا ہے۔

شیخ نور محمد کی شروع ہی سے خواہش تھی کہ ان کے فرزند ارجمند اقبال ان کی زندگی میں ہی شہرت و عظمت کا مالک ہو اور اس کی کوششیں ملت اسلامیہ کے حق میں تعمیری ثابت ہوں، لہٰذا انہیں جب بھی موقع ملا تو انہوں نے اقبال کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی تربیت ایک مقدس فریضہ جان کر کی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے والد کی رہنمائی اور ہدایت پر ایک منفرد انداز سے قرآن پاک کا مطالعہ کیا۔

حضرت علامہ اقبال کے کلام اور ان کے افکار کا مطالعہ بنظرِ عمیق کیا جائے تو کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''علامہ اقبال کی تخلیقی شخصیت کا مطالعہ کرنے پر اگرچہ وہاں فکر و معانی کی کئی جہات نظر آتی ہیں، افکار کا تنوع ملتا ہے، تصورات کی تشکیل نو ہوتی ہے اور سوچ کے لئے آفاق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب تمام کلام کا جائزہ لیا جائے تو اس کثرت میں وحدت کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ بالفاظ دیگر علامہ اقبال کی شاعری میں خیالات کا تنوع تو ہے لیکن اس کی اساس اسلام اور قرآن مجید پر استوار ہے۔۔۔۔ یوں سمجھئے کہ علامہ اقبال کے افکار قرآنی احکام اور تعلیم کا پرتو ہیں۔۔۔ لہٰذا جب انہوں نے خودی کا سرِ نہاں کلمہ طیبہ قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے فکر کی اساس قرآن مجید کی تعلیمات پر استوار ہے۔''(1)

علامہ اقبال نے قرآن مجید سے جس طرح استفادہ کیا اس کا مطالعہ کئی جہات پر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کے مثالی انسان کا تصور اسلامی ہے۔ انہوں نے انسانی شخصیت میں جن اوصاف کو اعلیٰ ترین گردانا وہ سب کے سب قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔ علامہ اقبال نے مردِ مومن کی صورت میں مثالی انسان کا جو تصور پیش کیا اور اس میں جس سے جلال و جمال کا امتزاج کیا، یہ تمام آنحضرتؐ کی شخصیت کے اوصاف جمع کر دینے والی بات ہے۔ ایسے اوصاف جن کا

سرچشمہ قرآن مجید بنتا ہے۔ اسی طرح جب انہوں نے مسلمانوں کیلئے فقر، قناعت، عدل، شجاعت اور صداقت جیسے اوصاف حمیدہ کو ضروری قرار دیا اور یہ کہا کہ یہ وہی اوصاف ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جن کی تلقین اسلام نے کی۔ الغرض علامہ اقبال نے ان تمام صفات کو انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے ضروری قرار دیا ہے جو کہ اسلامی نقطہ نظر سے افضل ترین قرار پاتی ہیں۔

اگرچہ علامہ اقبال مغربی علوم اور مشرقی فلسفہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے تاہم ان کے افکار کا امتیازی وصف قرآنی اساس ہی رہی ہے اور علامہ کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ علامہ اقبال قرآن حکیم سے والہانہ شغف رکھتے تھے۔ یہی والہانہ لگاؤ ان کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔

قرآن حکیم سے علامہ اقبال کو بے حد شغف تھا۔ وہ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے۔ قرآن حکیم پڑھتے ہوئے وہ بے حد متاثر معلوم ہوتے تھے۔ پڑھتے جاتے اور روتے جاتے حتیٰ کہ اوراق مصحف تر بتر ہو جاتے اور ان کو دھوپ میں سکھایا جاتا۔

مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے بلکہ نماز کے دوران جب با آواز بلند پڑھتے تو وہ آیاتِ قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔

عباد اللہ فاروقی لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبالؒ اپنے مشہور و معروف خطبات میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن کے دل پر بھی کتاب (قرآن حکیم) کا نزول ویسا ہی نہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ پر ہوا تھا۔ اس کا سمجھنا محال ہے۔''(2)

یہ قول معاً ان کی زندگی کے ایک واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اقبال سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے تو وہ صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی دوران ان کے والد محترم ان کے پاس آئے اور فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترتا ہے جیسا محمدؐ کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزہ نہیں۔

اس واقعہ کو علامہ اقبال نے بالِ جبریل میں اس طرح ادا کیا ہے:

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے رازیؒ نہ صاحب کشافؒ (بالِ جبریل)

چونکہ کلام اقبال کی اساس اسلام اور قرآن حکیم پر استوار ہے اس لیے علامہ کے اسلوب میں جا بجا قرآن حکیم کے حوالے اور تلمیحات ملتی ہیں۔

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بینِ خلیلؑ

.....

صنم کدہ یہ جہاں اور مرد حق خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے

یہ اشعار قرآن حکیم میں توحید باری تعالیٰ کے ضمن میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔(3)

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ایک حرکی مذہب ہے'' تو اس کی تعلیمات میں اتنی توانائی ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اسلام کو مسلمانوں کی زندگی میں ایک فعال قوت کے طور پر روشناس کرایا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن مجید محض کتاب مقدس ہی نہیں بلکہ مصافِ زیست میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والی کتاب مبین بھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے خلاف تھے کہ مسلمان لفظاً تو قرآن مجید کا پرچار کریں لیکن عملاً وہ اس کی پاکیزہ تعلیمات سے دور ہوں۔ وہ قاری اور کتاب میں دوری کے قائل نہ تھے۔ اور نہ ہی مسلمان کو قرآن مجید سے دور دیکھنا چاہتے تھے۔

اسی لیے وہ کہتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

شاعر اقبال قدم قدم پر قرآن مجید سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں آیات کے جو بار بار حوالے ملتے ہیں تو اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اقبال ہر ممکن طور پر پیغمبرِ اسلام کی متعین کردہ صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں چاہتے۔

اقبال اور مشرقی فکر میں ڈاکٹر سلیم اختر یوں بیان کرتے ہیں:

''قرآن مجید نے دوٹوک الفاظ میں انسان کی انفرادیت کا اثبات کیا ہے۔ کتاب مقدس

نے قطعی طور پر شفاعت کے تصور کی تردید کی ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ کوئی فرد بھی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ مزید برآں ہر شخص کا حق صرف اسی پر بنتا ہے جو کچھ اس نے اپنی محنت اور قوتِ بازو سے حاصل کیا ہے۔۔۔ قرآن مجید میں بھی انسانِ کامل کے تصور کی تکرار ملتی ہے۔ انسان میں مسلسل ترقی کی بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ جنہیں بروئے کار لا کر وہ تسخیر کائنات کر سکتا ہے۔ انسان جوں جوں مدارج ارتقاء طے کرتا جاتا ہے۔ وہ بلحاظ مشابہت خدا سے قریب تر ہو جاتا ہے۔'' (4)

جہاں تک اس تصور کا تعلق ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے اندر کی خوشبو کا اظہار نہیں کر سکا اور زندگی بسر کرنے کے لیے بنی نوع انسانی سے رابطہ استوار کرنا لازم ہے۔۔۔ تو یہ تصور بھی قرآن مجید کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مثالی معاشرہ جو اقبال کی خودی کی نشوونما اور پختگی کے ذرائع کا حامل ہو، تو یہ بھی انسانی اطوار سے وابستہ ان ضوابط سے مطابقت رکھتا ہے جو انسانی معاشروں کے لیے قرآن مجید نے متعین کر رکھے ہیں۔

''اقبال کا تصور زمان بھی کتابِ مقدس سے مطابقت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا ''وقت کو برا مت کہو کہ وقت خدا ہے''

ان مثالوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے مشرقی فکر اور خاص طور پر قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کو کس حد تک اپنے دل میں سمو رکھا تھا۔ اور اپنے وجدان اور مطالعہ اسلام اور اپنے نور بصیرت سے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی کو اپنے لئے باعثِ افتخار ہی نہیں بلکہ توشۂ آخرت سمجھتے تھے۔

مشہور نقاد اور نکتہ دان جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے افکار کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اقبال نے 1914ء میں جب کہا تھا ''من ندائے شاعر فرداستم'' تو غالباً وہ قبولِ دعا کا لمحہ تھا۔ 1914ء کے بعد ہندوستان 1947ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی شاعری میں طرح طرح کے رجحانات نمودار ہوئے لیکن اقبال کے شاعر فردا ہونے کا تصور ایک اٹل نظریے کی طرح رہا۔'' (5)

کلامِ اقبال ایک ایسا سمندر ہے کہ اس میں گوہر شناس غواص کے لیے ہر بار ایک نیا موتی نکال لانا دشوار کام نہیں۔

ہاں دشواری یہ ہے کہ اس سمندر کی گہرائی بہت زیادہ ہے۔

کرم شب تاب است شاعر درشبستان وجود
در پرد بالش فروغ گاہِ ہست و گاہ نیست

.....

گاہ تیری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

.....

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

.....

دریں گلشن پریشاں مثل جوئم
نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئم
نہ من آغاز و نے انجام جوئم
ہمہ رازم جہانِ راز جوئم

.....

نمائم آنچہ ہست اندر رگِ گُل
بہار من طلسمِ رنگ و بو نیست

اقبال کے فلسفہ وشعر کی ساری داستان ایک تلاش حق ہے۔فلسفۂ اقبال کے لیے زندگی کا ایک نظریہ نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک سلیقہ ہے اگر فلسفے کو ایک الگ موضوع تصوّر کرلیا جائے تو اقبال اس کے شدید ترین مخالف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک موقعہ پر یہ کہا تھا:

''میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے میرے پاس کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مختلف نظام ہائے فلسفہ سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے نہ فلسفے کے اصولوں پر بھروسہ ہے نہ اس کے نتائج پر۔شاید ہی کسی شخص نے فلسفے کی اس شدت سے تردید کی ہو جیسے میں نے کی ہے۔اس فلسفے کی جس سے مذہب کے اساسی اور قطعی حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کوئی شک نہیں کہ میں نے ایسے موضوعات پر لکھا ہے جس سے

فلسفیوں کو بھی دلچسپی ہے، لیکن میرے لئے یہ موضوعات محض فلسفیانہ استدلال و براہین نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔''(6)

فلسفے کی جانب اقبال کا یہ رویہ اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ ان کے دل ناصبور کی ساری تڑپ ان کے سوالات میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ اقبال نے اکثر فلسفیانہ مسائل کا حل خالص شاعری کے انداز میں پیش کیا ہے۔۔۔ یہ اخفا اور ابہام کا عنصر اقبال کی شاعری کی جان ہے۔ لیکن اخفا و ابہام کے اس عنصر کو اقبال نے ایک اسلوب عطا کیا ہے کہ بظاہر اقبال کا انداز بیان کئی موقعوں پر براہ راست اور دوٹوک معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ذرا غور کیا جائے تو وہی انداز بیان جو بادی النظر میں براہ راست نظر آتا ہے دراصل تہہ در تہہ معنویت کا حامل ہے۔

محمد شفیع عارف دھلوی یوں بیان کرتے ہیں:

''ایسی ہی عظیم یگانہ روزگار ہستی حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال کی ہے جنہیں نازش دانش و بینش، جمال آدمیت اور شمع علم و آگہی، جو کچھ بھی کہا جائے، زیب دیتا ہے۔ وہ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کا ہر رخ اور ہر گوشہ جلوہ فروش صد طور تھا۔ وہ ایک عظیم مفکر، کامیاب فلسفی، مایہ ناز قومی شاعر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم دردمند انسان تھے۔ ان کی تمام زندگی، مسلمانانِ برصغیر کی جدوجہد آزادی اور عالم اسلام کے اتحاد اور ملی شعور کو بیدار کرنے سے عبارت ہے۔''(7)

علامہ اقبال کی شاعری ہمیں فکر و فلسفہ کے جمالستان کی سیر کراتی ہے، علامہ اقبال کے عہد میں اگر فلسفہ، منطق اور حکمت کو اعلیٰ تعلیم کا معیار سمجھا جاتا تھا تو فلسفہ اور شاعری کی راہیں جُدا اور منزلیں الگ الگ تصور کی جاتی تھیں۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ فلسفہ خالصتاً عقل کی گفتگو ہے اور شاعری لطیف جذبوں کی حدیثِ دلبراں۔ عقل اور دل کبھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ عقل و دل یا فلسفہ و شعر کو یوں شیر و شکر کر دیتے ہیں کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری پر فلسفہ کا رنگ اس وقت چڑھنا شروع ہوا جب وہ یورپ میں تھے۔ اس وقت پورے یورپ میں نطشے کے فلسفے کی بڑی شہرت تھی۔ اس کے افکار چونکا دینے والے تھے۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ علم و عمل کی دنیا میں ساری تگ و دو ایک ایسے فرد کی تخلیق کے لیے جو ارتقاء کا نقطہ آخر اور فطرت کا سب سے بڑا شاہکار ہوگا۔ اور فوق البشر کہلائے گا۔

Acc. No.
Date

اقبال نطشے کے اس فلسفہ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس نظریے کو نطشے سے لیا ضرور لیکن اسے خالص اسلامی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی اور نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ نطشے نے جس فرد کی نشاندہی کی ہے وہ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا جس کے لیے فرمایا گیا ہے ''وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ'' اقبال اس رسول عالی مرتبت ﷺ کی شان میں رطب اللسان بھی ہوئے اور آپ ﷺ کے دیئے ہوئے نصب العین حیات کو ہر مسلمان میں دیکھنے کے آرزومند بھی رہے۔

دنیائے اسلام میں گزشتہ ایک ہزار سال میں جو مفکر پیدا ہوئے ان میں اقبال کا درجہ سب سے بڑا ہے۔ وہ ایک فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان میں فلسفہ اور شاعری دونوں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اس کی مثال کسی اور بڑے مفکر میں دکھائی نہیں دیتی۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

.....

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

''اقبال کے کلام میں یہ فلسفہ مربوط شکل میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے فلسفہ و تاریخ اور مذہب کا مطالعہ ایک ساتھ عمیق نظر سے کیا تھا۔ اور صرف یہ نہیں کہ ان کا مطالعہ اسلامی تاریخ اور تہذیب و نظریات تک محدود تھا بلکہ یورپ کی فضا میں قیام کے دوران انہوں نے یورپ کے فلسفہ و نظریات کا بھی بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اسی لیے ان کی تمام شاعری اپنے فکری عناصر کا مرقع بن گئی جس میں رفعت تخیل کا بھی بڑا دخل ہے۔''(8)

تاریخ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ ''ارخ'' ہے جس کے معنی حالات و واقعات کو بیان یا اندراج کرنا کے ہیں۔ تاریخ کے لغوی معنی تجربہ کرنا، اندارج کرنا و تحریر کرنا وغیرہ کے ہیں۔ تاریخ کے لغوی معنی تحریر کرنا، اندراج کرنا وغیرہ کے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکرم اپنے مقالہ ''کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیات اور اُن کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط'' میں رقم طراز ہیں:

''گویا تاریخ کا مفہوم اصطلاحاً عام طور پر عہد گزشتہ کی وہ داستان ہے جس کا تعلق انسان سے ہے۔ مشہور مورخ ٹائن بی کا خیال ہے کہ تاریخ کا نقطۂ آغاز وہ دور ہے جب انسان نے ایک مہذب معاشرے کے فرد کی حیثیت اختیار کی۔ اس نظریۂ تاریخ کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرے میں پیش آنے والے واقعات اور حوادث اور انسان کے اعمال وافعال کے سلسلے کو انسانی تاریخ کہنا چاہیے۔۔۔ تاریخ کے بارے میں ہیگل کہتا ہے کہ تاریخ ہمیں صرف یہ سکھاتی ہے کہ ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ اس کے باوجود وہ تاریخ کو قابلِ فہم اور قابلِ تشریح خیال کرتا ہے۔'' (9)

تاریخ مجرد واقعات سے تعبیر ہے۔ اس صورت میں مورخ کا کام اس سے زیادہ نہیں رہتا کہ جو کچھ ہوا ہے اور گزرا ہے اس کو من وعن دہرا دے اور بڑی بڑی قوموں اور بادشاہوں کی داستانِ عیش کو دیانت داری سے بیان کر دے۔

دوسرا تصور جو اپنے اندر وقعت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ مورخ واقعات کو صرف بیان نہ کرے بلکہ اس میں ربط وتسلسل کا ایک قدرتی سلسلہ ہے، اس کو بھی دریافت کرے اور ان مقامات واحوال کی نشاندہی بھی کرے جو قوموں کے عروج وادبار کا باعث اور سبب ہو سکتے ہیں۔

ابن خلدون نے تاریخ کو باقاعدہ فن قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تاریخ کا ان فنون میں شمار ہوتا ہے جن کو تمام قومیں عام طور پر پڑھتی پڑھاتی رہتی ہیں۔ اور سفر تک کی تکالیف اس کی خاطر برداشت کرتے ہیں۔ عوام وجہال بھی اسی کی معرفت کی راہ میں پیش قدمی دکھاتے ہیں اور ملوک واکابر بھی اس میں انتہائی رغبت ووابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ غرض علما و جہلا ہر دو برابر اس میں اپنے ذہنی مذاق کا سامان مہیا پاتے ہیں۔'' (10)

ابن خلدون بھی تاریخ کی تعریف اسی طرح کرتے ہیں جس طرح کہ دوسرے مسلمان مورخین۔ البتہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مطالعۂ تاریخ گہرے غور وخوض کا تقاضا کرتا ہے۔ تاکہ سچائی تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ اشیاء سے متعلق تمام حقائق واضح ہو جائیں۔ تاریخ گہرے اور عمیق مطالعے کی متقاضی ہے۔ ابن خلدون زور دے کر کہتے ہیں کہ تاریخ کی جڑیں فلسفے میں پیوست ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ابنِ خلدون کی ساری تاریخی بصیرت کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور ظاہر ہے کہ ابن خلدون کو علم الاجتماع کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ابنِ خلدون کے تصور تاریخ کی بڑی اہمیت ہے۔ علامہ اقبال نے ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے نظریے کو قرآن سے اخذ کردہ

قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ابن خلدون کی اہمت اس لیے ہے کہ وہ پہلا مسلمان مفکّر اور مؤرخ ہے جس نے تاریخ کو ایک علم کی حیثیت سے مدون کرنے کی ضرورت محسوس کیا۔۔۔ اقبال کے لیے ابن خلدون کی اہمیت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ابن خلدون نے تاریخ کے عمل کو بہت حد تک قرآن کریم کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ نیز اس نے تاریخ کو عمرانی نفسیاتی حقائق کے ذریعے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

فلسفہ تاریخ کے سلسلے میں اقبال مغربی حکماء سے الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔۔۔ اقبال اپنے نقطۂ نظر کو قرآن کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ فرد کو اتنا حقیر، بے حقیقت اور واقعات کے سامنے بے دست و پا نہیں گردانتے۔ وہ اسے نیابت الٰہی کا حقدار قرار دیتے ہیں اور اسی نکتے سے ان کا نظریۂ خودی تقویت پاتا ہے۔ اور یہیں سے فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔

اقبال کے فلسفیانہ افکار کا یہ پہلو کائنات کے بنیادی حقائق کے علاوہ تاریخ کی افادیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصۂ افسانہ
ایں ترا از خویشتن آگاہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں
جسمِ ملّت را چو اعصاب است ایں
ضبط کن تاریخ را پاینده شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
دوش را پیوند با امروز کن
زندگی را مرغِ دست آموز کن
رشتۂ ایام را آور بدست
ورنہ گردی روز کور و شب پرست

سرزند از ماضی تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگی است
مے کشاں را شور قلقل زندگی است

اقبال کے نظریہ تعلیم میں تاریخ خاص طور پر تاریخ اسلام کی بڑی اہمیت ہے۔ تاریخ اقبال کے نزدیک قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ اقبال کی رائے میں قوموں کا عروج، بنیادی اقدار سے گہری وابستگی سے اور زوال عدم وابستگی سے پیدا ہوتا ہے۔ قومیں اس وقت زوال پذیر ہو جاتی ہیں جب وہ اپنے مقصودِ حیات سے کنارہ کش ہو جائیں۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیٔ رود حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

اس ملی شعور کی پرداخت کی خاطر اور زوال سے بچنے کے لیے اقبال تاریخ کے مطالعے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم انصاری اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون ''اقبال کا تصورِ تاریخ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کا تاریخی شعور بہت گہرا ہے۔۔۔ اقبال اردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو تاریخ سے وابستہ کیا۔ ان کے تحت الشعور میں تاریخی شعور کو پروان چڑھانے کی خواہش شروع ہی سے موجود تھی۔ ان کی اولین معروف نظم ''ہمالہ'' میں اس کا جزوی اور بار بار اظہار ملتا ہے۔ وہ کوہ ہمالہ سے کہتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی گزری ہوئی زندگی کا ماجرا بتائے کہ تہذیب کے ابتدائی ادوار کیسے تھے۔''(11)

علامہ اقبال کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ اس قدر اہم ہے کہ وہ اپنے خطابات میں قرآن مجید کے حوالے سے مشاہدات باطن اور عالم فطرت کی طرح تاریخ کو علم انسانی کا ایک سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد اکرم:

> ''علامہ اقبال کے نزدیک تاریخ کسی ایک قوم کسی ایک علاقے کے باسیوں کی تاریخ نہیں

بلکہ تاریخ تو پورے عالم انسانیت کی میراث ہے۔علامہ اقبال کی نظم اور نثر میں جا بجا تاریخ کے حوالے ملتے ہیں۔علامہ اقبال کے نزدیک تاریخ فطرت کے اعلیٰ مقاصد میں مصروفِ عمل ہونا ہے۔۔۔علامہ اقبال کے نزدیک تاریخ کا اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے۔قرآن مجید اخلاقیات کا منبع ہے۔علامہ اقبال کے فلسفہ کا مآخذ قرآن اور سنت ہے۔۔۔علامہ اقبال کا نقطہ نظر ہے کہ وہی قومیں انقلاب سے بچ سکیں جنہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے عروج و زوال پر غور نہیں کیا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔''(12)

علامہ اقبال نے شاعری میں تاریخ کے دریچے اس وقت کھولے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ آج مسلمانانِ عالم روبہ زوال اس لیے ہیں کہ وہ عظمت رفتہ کو بھول گئے ہیں۔اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی اور تاریخ یاد دلانا ضروری سمجھا اور اس کے لیے انہوں نے فکر و فلسفہ کا سہارا لیا۔علامہ اقبال کے کلام میں جو تاثیر کا عنصر پایا جاتا ہے وہ تاریخی حوالے ہیں۔۔۔یہ تاریخی اساس ان کے گہرے ملی شعور سے ابھرتی ہے اور شاعری کے افق پر منڈلاتی ہوئی گھٹاؤں کی چلمن سے جھانکنے والی برق جمال در آغوش کی جلوہ سامانیوں اور حشر خیزیوں کا سبب بنتی ہے۔علامہ اقبال نے عالم اسلام کے تاریخی حوالوں سے زوال آمادہ ملت اسلامیہ میں جذبہ حریت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔بلکہ اس کے ذریعے نورِ بصیرت اور تحریک عمل کا پیغام بھی دینا چاہتے ہیں۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت نہیں سکتی
کہ تو گفتار ، وہ کردار ، تو ثابت ، وہ سیّارہ
دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

حواشی وحوالہ جات

1- سلیم اختر، ڈاکٹر، فکر اقبال کی اسلامی اساس (لاہور، اقبال اکادمی، 1985ء، ص:482)

2- محمد عمران، قریشی، پروفیسر، کلام اقبال میں تلمیحاتِ قرآنی (سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، 2002ء، ص:83)

3- محمد عمران، قریشی، پروفیسر، کلام اقبال میں تلمیحاتِ قرآنی (ص:84)

4- سلیم اختر، ڈاکٹر، فکر اقبال کا تعارف، (اقبال اور مشرقی فکر)، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1983ء، ص:62)

5- سلیم اختر، ڈاکٹر، دیباچہ: جگن ناتھ، آزاد، اقبال، شخصیت، افکار و تصورات (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء، ص:7)

6- سلیم اختر، ڈاکٹر، دیباچہ: جگن ناتھ، آزاد، اقبال، شخصیت، افکار و تصورات (ص:9، 10)

7- محمد شفیع عارف، دہلوی، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال مضمون مشمولہ (اسلام آباد، سہ ماہی الاقربا، 2002ء، ص:55)

8- محمد شفیع عارف، دہلوی، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال مضمون مشمولہ (سہ ماہی الاقربا، ص:56، 57)

9- محمد اکرم، ڈاکٹر، کلام اقبال میں تاریخی شخصیات اور ان کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط کا جائزہ (مقالہ پی ایچ ڈی، اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد 2004ء، ص:2)

10- محمد اکرم، ڈاکٹر، کلام اقبال میں تاریخی شخصیات اور ان کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط کا جائزہ (مقالہ پی ایچ ڈی، ص:3)

11- اسلم انصاری، ڈاکٹر، اقبال کا تصوّر تاریخ (غیر مطبوعہ مقالہ جو یوم اقبال کے سلسلے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے زیر اہتمام 9 نومبر 2002ء کو پیش کیا گیا۔)

12- محمد اکرم، ڈاکٹر، کلام اقبال میں تاریخی شخصیات اور ان کے ساتھ علامہ اقبال کے ذہنی روابط (مقالہ پی ایچ ڈی اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیوسٹی، اسلام آباد 2004ء، ص:10)

باب سوم

علامہ اقبالؒ اور عشق رسول ﷺ

علامہ اقبالؒ کا اسلاف سے قلبی لگاؤ کا جائزہ

اقبال اور عشق رسولؐ

اقبال کے فلسفۂ نظامِ فکر میں عشق رسولؐ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ان کے نزدیک اسلام کی بنیاد بھی یہی عشق رسولؐ ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

.....

تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اَبُ و اُمُ گشتۂ محبوب تر (1)

''جب سے میری نظر آپ کے چہرہ مبارک پر پڑی ہے، آپ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے ہیں۔''

حضرت علامہ اقبال کا قلب عشق رسول سے منوّر تھا۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ سلّم کے لیے بے حد ادب احترام تھا۔ انہیں بانیٔ اسلام اور اکابرِ تاریخ اسلام سے بے حد لگاؤ تھا۔ عشقِ رسول کریمؐ ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ حضور سرور کائنات ﷺ کا ذکر سُنتے ہی اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ علامہ کے کلام میں جا بجا رسول کریم ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار ملتا ہے۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

.....

می ندانی عشق و مستی از کجاست
ایں شعاعِ آفتاب مصطفٰیؐ است

صبح کی نماز اور تلاوتِ کلام مجید ان کا باقاعدہ معمول تھا۔ وہ تلاوت کے وقت کلام الٰہی کے اثر سے اکثر اشکبار ہو جاتے تھے۔ وہ اسمائے الٰہی، کلامِ الٰہی اور دوسرے بابرکت کلمات کی تاثیر کے قائل تھے۔

فرشہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اقبال کے نظامِ فکر کا مرکزی نقطہ خودی ہے جس کے بے پایاں امکانوں کی اس نے جا بجا پردہ کشائی کی ہے۔ خودی میں صرف تسخیر کائنات کی صلاحیتیں ہی نہیں بلکہ اپنی سب سے بڑی مدمقابل ''موت'' پر بھی قابو پانے کی قابلیت اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تاکہ اس کے ارتقا کی کوئی منزل آخری منزل نہ ہو۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ ، مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے (کلیاتِ اقبال، اردو)

خودی کی تکمیل کے لیے عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ عشق نہ صرف زندگی کی ضمانت ہے بلکہ موت کے بعد حیات بھی اسی کی بدولت ممکن ہے۔ عشق سے زندگی میں استحکام اور موت کے بعد کی زندگی پر اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ عشق کا غلام ہے کیونکہ وہ زمانے سے بالاتر ہے اور روح کا اصلی جوہر ہے۔

علامہ اقبال عشق کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سُبک سیل ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام (کلیاتِ اقبال، اردو)

علامہ اقبال عشق کو ابدیت کے نسخہ دیرینہ کی تمہید بتاتے ہیں۔ یعنی اس کی مدد سے حیاتِ دوام حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے خورشید کے آگے شامِ اجل شرمندہ دکھائی دیتی ہے۔ یعنی اسے موت کا خطرہ نہیں۔ موت ہر چیز پر غالب آسکتی ہے لیکن عشق پر اس کا زور نہیں چلتا۔

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی ، زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

موت کے بعد شخصیت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ عشق ہے۔ جس کی بدولت کائنات میں خودی اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ آدمی کا جسم خاک میں مل جاتا ہے لیکن اس کی روح عشق کے ذریعے اپنے مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔

عشق کا جو تصوّر اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا تصوّر ہے۔ اور اس کی حقیقت کی جستجو، اور اس دیکھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دور سے طور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس تصوّر نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ فلسفیانہ مبحث بنتا گیا۔ دوسرے شاعری لطافت ''سادگی اور پرکاری'' نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے ان کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے:

اقبال شاعری کے لیے ہمیشہ ایک ''مقصد'' کو اپنا منتہائے نظر بنائے رہے۔ خود ''شعر'' کی اہمیت ان کے مقصد میں زیادہ نہ تھی۔ ان کا پیغام الفاظ کی طرح جذبات سے بھی ''ماورا'' رہا۔ اور ہر وہ شاعر جو پیغام لے کر آتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا رہبر ہوتا ہے۔ محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ پھیکا رہا۔ جہاں انہوں نے عشق کے جذبے سے اپنے ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے۔ لیکن جہاں انہوں نے عشق کا بلند اور پاکیزہ تصور ایک قوم کے لیے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اس میں رفعت اور بلندی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی شانِ رہبری نے عشق کو ان کے نزدیک ایک تصور بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصور جو ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کو گرما سکے۔

صوفیہ کے نزدیک روح انسان ایک ابدی حقیقت ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست ذات خداوندی سے ہے۔ اور اس کا تعلق جزو اور کُل کا تعلق ہے۔ صوفیہ ذاتِ خداوندی کو روحِ مطلق قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ اسے اس کو حسنِ مطلق بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ مانتے ہیں کہ اس سے آگے حسن حقیقی کا ہی پرتو ہے۔ ادھر روحِ انسانی

اپنے اصل سے ملنے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ اس کے اضطراب اور بے چینی کو اصطلاحاً صوفیا ''عشق'' کا نام دیتے ہیں۔ اس صورت میں روح انسانی عاشق ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ معشوق۔ صوفیہ عموماً اس بیان کو مجازی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اس طرز بیان سے لوگوں کو مادی محبت کا گمان گزرنے لگا۔

ان لوگوں کے برعکس مولانا رومؒ نے کسی قسم کے ابہام سے کام نہیں لیا۔ بلکہ صاف صاف اور واضح طریقے سے تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کیا۔ مولانا کا عشق بھی حقیقی ہے تو بیان بھی حقیقی ہے۔ فارسی ادب کے صوفیانہ مسلک میں مولانا روم پہلے شخص ہیں جنہوں نے عشق حقیقی کا نغمہ واضح انداز میں چھیڑا۔

روحِ انسانی کے بارے میں مولانا رومؒ کا یہ نظریہ ہے کہ انسانی جسم میں آنے سے پہلے روحِ مطلق و ذاتِ خداوندی کا ایک حصہ تھی۔ اور ہر لمحہ وصل سے بہرہ یاب ہوتی۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی کام اور مصروفیت نہ تھی۔ اب یہ روح انسانی قالب میں آنے کے بعد اپنے اصل سے جُدا ہوگئی ہے۔ اور یہ دنیائے آب و گل اسے راس نہیں آئی۔ چنانچہ وہ اپنے اصل سے ملنے کے لیے بے چین اور بے تاب رہتی ہے۔ وہ اپنی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار اس طرح آہ و فریاد کر کے کرتی ہے۔

بشنو از نے چون حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستان تا مرا بریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

(مثنوی مولانا روم۔ دفتر اول) (2)

مولانا رومؒ کو ذاتِ باری تعالیٰ سے عشق تھا۔ اس عشق میں اتنی شدت ہوگئی کہ مثنوی کا کوئی بھی دفتر اس کے اظہار سے خالی نہ رہا۔ حتیٰ کہ مولانا کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ عشق کو پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کر پائے اور اپنے آپ کو شرمندہ عشق قرار دینے لگے۔

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں
چو بعشق آیم خجل باشم ازاں (مثنوی مولانا روم)

مولانا رومؒ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی روح دنیاوی دھندوں میں پھنس کر طرح طرح کی آلودگیوں میں مبتلا ہوگئی ہے اور اس میں روحانی پاکیزگی کے بجائے روحانی عیوب داخل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ان عیوب کے سبب روحِ انسانی اپنی منزل کو حاصل کرنے میں ناکامی محسوس کرتی ہے۔ اس کا علاج مولانا رومؒ کے نزدیک عشق ہے۔

شادباش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ عِلّت ہائے ما (مثنوی مولانا روم)

روح انسانی اپنی اصل سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ اس میں صرف ایک روحِ انسانی کا مذکور نہیں۔ بلکہ تمام مخلوقات کی روحیں اپنے اندر فراق کی بے چینی اور ہجر کی بے تابی پاتی ہیں۔ ان کی اصل سے ملنے کی خواہش جذبۂ عشق کو جنم دیتی ہے۔ عشق ایک ایسی بے پناہ طاقت ہے جس سے اجسام خاکی بھی آسمانوں پر پہنچنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں:

جسمِ خاکی از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خر موسیٰ صاعقا (مثنوی مولانا روم)

''مثنوی کا تعلق فلسفے کی اس شاخ سے ہے جو کردار و اخلاق پر بحث کرتی ہے۔ اس کا معیار اقدار تخیلاتی نہیں بلکہ عملی ہے جس کا مقصد ان لوگوں کو تسکینِ قلب فراہم کرنا ہے جو زندگی کی اذیتوں کا نشانہ بنے ہوتے ہیں۔''(3)

''مولانا رومؒ کے مطابق روح انسانی جسم میں داخل ہونے سے قبل روحِ مطلق کا حصہ تھی۔ انسانی پیکر میں آ کر یہ روح جسمانی خوبیوں میں گھر کر روحانی صفات کھو چکی ہے اور اپنے اصل کی طرف لوٹ جانے کے لیے بے تاب و مضطرب ہے۔ مولانا رومؒ کے کلام کا اہم ترین موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ جس سے ان کی روح معطّر رہتی ہے اور وجد و مستی میں لمحہ لمحہ دلنشین نغماتِ معرفت بکھیرتی ہے۔ مولانا نے فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ سعی و عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ مولانا نے جبر و قدر جیسے نازک اور پیچیدہ مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ عقل کی افادیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر عشق کو

امام سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مسئلہ ارتقاء کے بھی کئی پہلو واضح کے ہیں۔ مولانا کے نزدیک انسان عشق و روحانیت کے مسلسل مراحل طے کر کے ایک ایسا ارفع مقام حاصل کر سکتا ہے جہاں پہنچنے کے بعد ربِّ جلیل اس کی کسی استدعا اور دعا کو رد نہیں کرتا۔ انہوں نے معاشرتی اصلاح اور انسانی عظمت کے حصول کے لیے بھی نسخہ ہائے اکسیر تحریر کیے ہیں۔''(4)

علامہ اقبالؒ کے مطابق حیات و کائنات کے ان لاتعداد اور گوناگوں مظاہر کی حقیقت صرف ایک ذات ہے۔ اس لیے وہ موجود بالذات ہے۔ یعنی وجود اس کا خانہ زاد ہے، کسی کا عطا کردہ نہیں۔ یہی ذاتِ واحد حقیقت الحق ہے اور اس کی ذات کا تقاضا عمل ہے۔ جسے تصوّف کی اصطلاح میں تجلی یا جلوہ گری کہتے ہیں اور قرآن حکیم اسی کو ''شان'' ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ'' سے تعبیر کرتا ہے۔

اقبال کا ایقان ہے کہ انسانی شخصیت، عشق اور ضبطِ نفس کے بغیر مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک عشق ایک وسیع اصطلاح ہے جو کائنات کے ذروں کے جذب و انجذاب سے لے کر خدائے لم یزل کی محبت تک وسیع ہے۔ اقبال نے عشق کی اصطلاح رہبانی اور مادی رویوں کی نفی میں بھی استعمال کی ہے۔ عشق کے جذبے سے مثبت اور وجدانی رویے تشکیل پاتے ہیں۔ عشق کی بدولت عقلی دھارا مصفّٰی و مجلّٰی ہو کر وجدانی دھارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس کی عمیق و وسیع کائنات کا کھوج لگاتا ہے۔ اقبالؒ کے تصورِ عشق میں صوفیانہ مفہوم بھی ہے اور آرٹ کی تخلیق کرنے والی والہانہ لگن کا بیان بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عشق کی اصطلاح کو عمرانی غایات کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

''صوفیائے اسلام نے عشق کو عشقِ حقیقی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ صوفی عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ کے ماسوا کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس کی عبادات، اُس کی ریاضتوں، صبر و ثبات اور اس کے خدمتِ خلق کے کارناموں کا حتمی مقصود حُبِ الٰہی اور رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ وہ نہ حور و قصور کا طلبگار رہتا ہے اور نہ ہی عیشِ جنت کے طرب کا دلدادہ۔ وہ صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے اور جلوہ ہائے خداوندی کے مشاہدے میں سرشار رہتا ہے''۔۔۔ اقبالؒ بھی ایک صوفی کی طرح والہانہ عبادت کے قائل تھے جس میں کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو۔ وہ اپنے من میں ڈوب کر قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔۔۔ علامہ اقبالؒ نے عشق کو رازِ حیات اور سببِ تخلیقِ کائنات قرار دے کر اس کے ہزاروں مقامات بتائے ہیں۔''(5)

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات ، موت ہے اُس پر حرام
تُند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے ، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام (کلیات اقبال، اردو)

اقبال کے کلام میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ بڑے بڑے معرکے اور بڑے بڑے کارنامے عشق کی بدولت سرانجام پائے۔ اگر عشق نہ ہو تو شریعت کے احکام کی بجا آوری ریاکاری ہے اور صلوٰۃ و صوم محض رسوم (Rituals) رہ جاتی ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

''الغرض اقبالؒ کا تصورِ عشق، زندگی اور عمل سے عبارت ہے۔ امنگوں سے خالی زندگی اور جمال فطرت سے بے حسی شخصیت کو افسردہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس فکر و ذکر اور جدو جہد حیات سے انسانی شخصیت مستحکم ہوتی ہے۔ اقبال کے تصوّرِ عشق سے انسانی شخصیت، توانائی اور تخلیقی فعلیت کے اوصاف سے متصف ہو کر خود بینی، خودنگری اور جہاں بانی کی اہل ہو جاتی ہے۔'' (6)

اقبال نے حقیقت و ماہیت شخصیت پر غور و فکر کرتے وقت قرآنی تعلیمات کو اپنا رہنما بنایا ہے اور جدید مغربی تحقیقات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اُن کا مطمح نظر ایسا معاشرہ تھا جس میں اعلیٰ انسانی اقدار کا دور دورہ ہو۔ اقبال اقوام کی قیادت کے لیے اعلیٰ شخصیت کے حامل انسانوں کی تمنا کرتے تھے جن کی نگاہ بلند ہو، سخن دل نواز اور جاں پُرسوز ہو۔ اُن کے سامنے انسانِ کامل کا نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی شخصیت تھی۔ پیغمبر اسلام کی خودی مقام اکملیت پر فائز تھی۔ اُن کی ذات میں انسانی محاسن حدکمال تک مجسم ہو گئے تھے۔ وہ کامل حریت و سلطانیت کے اُس مقام محمود پر تھے جہاں زمان و مکان بے معنی ہو جاتے ہیں اور لامتناہی خودی کے جلوؤں کا بےحجابانہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال کے نظامِ فکر اور تصورِ تصوّف میں مقامِ فنا اور مقامِ بقا کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک اصل

مقام، مقامِ عبدیت ہے اور سالک کے سامنے عبدہ کا نمونہ ہے جو کہ خاتم النبیّین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں۔۔۔علامہ اقبالؒ نے عبدہ کی تشریح ''جاوید نامہ'' میں یوں کی ہے۔

عبدہ ، از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہ ، صورت گر تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہ ، دہر است و دہر از عبدہ ، است
ماہمہ رنگیم و او بے رنگ و بو است
کس ز سرِّ عبدہ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِّ اِلّا اللّٰہ نیست
لا اِلٰہ تیغ و دم او عبدہ،
فاش تر خواہی بگو ہُو عبدہ،
مدعا پیدا نہ گردد زیں دوبیت
تا نہ بینی از مقام مارمیت (7)

(کلیات اقبال، فارسی، جاوید نامہ)

علامہ اقبال نے قرآن حکیم اور حدیثِ نبوی کا چونکہ بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اس لیے انہیں اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چل کر ہی انسان بھلائی کی طرف راغب ہوسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اُردو شاعری میں جا بجا حضور اکرمؐ سے والہانہ عشق کے حوالے ملتے ہیں۔اس لحاظ سے عشق رسولؐ اُن کی شاعری کی روح اور ان کی فکر کی آبرو بن گئی۔گویا عشقِ رسولؐ ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔

اقبال اپنے فکر و تخیل کی دنیا میں خود کو ہمیشہ قافلۂ حجاز سے وابستہ سمجھتے رہے اور رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ان کے قلب و روح کے لیے سامانِ راحت بن رہی۔اور سفرِ زندگی میں ہر قدم پر اقبالؒ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہی کو اپنا ہادی و رہنما اور میر کارواں تسلیم کرتے رہے۔

سالارِ کارواں ہے میر حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں اپنا (کلیاتِ اقبال، اردو)

علامہ اقبالؒ عشقِ رسالت میں اس قدر مست اور مستغرق نظر آتے ہیں کہ انہیں ملی وجود کے لیے رسالت سے بہتر اور کوئی شے زیادہ وزنی نہیں محسوس ہوتی۔ عقیدت و محبت کا یہ جذبہ مثبت تمدنی و دینی مصالح پر مبنی ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

حمد بے حد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را
.....
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است
نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست (کلیاتِ اقبال، فارسی)

حضرت علامہؒ کو آنحضور سے عاشقانہ تعلق ہے۔ اس کی بنیاد پر وہ آپ ﷺ کی شخصیت کو جس انداز میں متعارف کراتے ہیں۔ اس میں گہری عقیدت و احترام کتنا واضح ہے۔

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
.....
درشبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
.....
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہم چو او بطن ام گیتی نہ زاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست (8)

علامہ اقبال سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت کا منظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضور ﷺ کی ذاتِ با برکات تمام صفات ارضی و سماوی اور کمالات ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے۔۔۔اقبال ایک انسانِ کامل کی تلاش میں ہے۔اس جستجو میں انہیں نورِ محمدی کی زیارت نصیب ہوتی ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ صرف وہ ہی ایک ایسے انسان تھے جن کی دینی و دنیوی زندگی عیوب سے پاک اور برائیوں سے مبرّا تھی۔اقبال کو گوہرِ مقصود مل جاتا ہے، وہ ایک ایسے انسانِ کامل کو پالیتا ہے جس کا وجود تمام نیکیوں کا سرچشمہ، تمام خوبیوں کا منبع اور تمام صفات کا مظہر ہے۔پیغمبرِ اسلام ہونے سے قطع نظر اقبال کو اُن سے والہانہ عشق اس لیے بھی ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اُن میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک کامل انسان میں ہونی چاہئیں۔

اقبال نہ صرف عشقِ حبیب ﷺ سے مخمور ہیں بلکہ دیارِ حبیبؐ کے بھی شیدا ہیں۔اُن کے لیے پیغمبر صحرا کے وطن کے سامنے جنت الفردوس بے حقیقت ہے۔

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا
موت آجائے تو یثرب کے کسی کوچہ میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے ''قُم'' مجھ کو (کلیاتِ اقبال، اردو)

عشق نبی ﷺ کو ہی وہ سب خامیوں کا علاج جانتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے قوم کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پُھونکی جاسکتی ہے اور امت کی بیداری کے لیے اس سے زیادہ کوئی حربہ کارگر نہیں۔

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشقِ نبی از حق طلب
ہر کہ عشقِ مصطفٰے سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست (9)

علامہ اقبال نے مقاصدِ رسالت محمدیؐ کا اہم جز و تعلیماتِ اتحاد و مساوات اور ترغیبِ اخوت قرار دیا ہے۔اقبال نے وطنیت کے تصور کو صرف اسی لیے رد کیا کہ اسے نبی اکرم ﷺ نے رد کیا تھا:

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورت ماہی

ہے ترکِ وطن سُنتِ محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے (کلیاتِ اقبال، اردو)

.....

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے

.....

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

آپؐ دونوں جہان کی کتاب کا دیباچہ ہیں۔تمام جہان غلام ہیں اور آپ ﷺ آقا ہیں۔یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی امت میں پیدا کیا ہے۔آپؐ کا اُمتی ہونا معمولی بات نہیں بلکہ یہ ایک ایسا شرف ہے جس کے لئے پہلے زمانے کے کئی پیغمبر بھی تمنا کرتے رہے۔

نسخہ کونین را دیباچہ اوست
جُملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

حُبِ رسول میں ڈوب جانے کی کچھ مثالیں اقبال نے بعض واقعات سے بھی پیش کی ہیں۔

پروانے کو چراغ ہے بُلبل کو پُھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''زندگی کے آخری ایام میں پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشکِ محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے۔وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ مدینۃ الرسول میں حاضر ہو سکے۔لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل، نیز اپنی قوتِ تخیل اور زورِ کلام کے ساتھ انہوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ اسی آستانے پر منڈلاتا رہا۔''(10)

علامہ اقبال رب کائنات سے انتہائی دردمندی اور لجاجت سے پُر درد التجا کرتے ہیں کہ روزِ محشر اُن کا حساب (اعمال کا حساب) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں نہ لیا جائے۔

تو غنی از ہر دو عالم ، من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم نا گزیر
از نگاہِ مصطفٰے پنہاں بگیر

ارمغان حجاز میں یہ مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ ما را
حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

(کلیاتِ اقبال، فارسی، ارمغان حجاز)

اقبال کا اسلاف سے قلبی لگاؤ:

علامہ اقبال کے ہاں اسلاف سے بے حد لگاؤ اور عقیدت صاف نظر آتی ہے۔ وہ خاصانِ خدا اور اہل اللہ سے بہت محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ان سے بہت عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ اقبال کی اس عقیدت اور احترام کی اساس، حُب قرآن اور حُب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں بے حد سوز و گداز تھا اور آپ حُب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر سرشار تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر خیر سن کر آبدیدہ ہو جاتے اور دیر تک روتے رہتے۔

علامہ اقبال صاحبِ بصیرت اور شیدائے اسلام تھے۔ وہ اسلام کو ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک انعام سمجھتے ہیں۔ وہ اسلام کی تاریخ، فلسفہ اور سیرت نبوی کو دل و جان سے عزیز جانتے ہیں اور انہی بنیادوں پر ان کی فکر کی شاندار عمارت استوار ہے۔

علامہ اقبال کو اپنی زریں تاریخ سے پیار ہے اور وہ اپنے اسلاف کے کارناموں، جذبہ اور عمل سے بھرپور زندگی پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اسلاف کی تاریخ کو نئی نسل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

علامہ اقبال ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار شیخ نور محمد روحانی شخصیت تھے۔ نیک والدین کی تربیت نے اقبال کی طبیعت پر گہرے نقوش مرتب کئے۔ جن کا اظہار اقبال کی زندگی بھر کے رویے اور ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ اقبال کی وابستگی اوائل عمر ہی سے تھی جس کی بنیاد پر انہوں نے قرآنی دنیا کی سیر کی اور اپنے افکار کو اس کے مطابق ڈھالا۔

قرآن مجید کے مطالعے میں اقبال کے استغراق کے متعلق مولانا سید ابوالحسن ندوی فرماتے ہیں۔

''علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور وفکر اور تدبر و تفکر کرتے گزاری۔ قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے، قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انہیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا۔ اس سے انہیں ایک نیا یقین، ایک نئی روشنی اور ایک نئی قوت وتوانائی حاصل ہوتی۔ جوں جوں ان کا مطالعۂ قرآن بڑھتا گیا ان کی فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی، اس لئے کہ قرآن ہی ایک ایسی زندہ جاوید کتاب ہے جو انسان کو لدنی علم اور ابدی سعادت سے ہمکنار کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی شاہ کلید ہے کہ حیات انسانی کے شعبوں میں سے جس شعبہ پر بھی اسے لگائے فوراً کھل جائے گا۔ وہ زندگی کا ایک واضح دستور اور ظلمتوں میں روشنی کا مینار ہے۔''(11)

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں تصور خودی اور عرفان ذات کا بہت دخل ہے۔ اسی بات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم (12)

اقبال کی سحر گاہی کا بھی ان کی شخصیت پر بہت اثر ہے، اقبال کے نزدیک سحر گاہی بہت ہی قیمتی سرمایہ ہے:

عطارؒ ہو رومیؒ ہو رازیؒ ہو غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی (کلیاتِ اقبال، اردو)

اپنے اسلاف سے قلبی لگاؤ اقبال کی میراث ہے۔ اقبال کے ہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر حضرت علیؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور دیگر اہل بیعت کی محبت اور عقیدت کے بھرپور تذکرے ملتے ہیں۔

علامہ اقبال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت اور فیض رسانی سے پوری ملت اسلامیہ کو فیض یاب ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لئے وہ کثرت سے درود شریف پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسوۂ حسنہ کو زندگی کی مشعل بنانے کی تاکید کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے دینی شخصیات کے ساتھ ساتھ اسلاف میں دیگر تاریخی شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ٹیپو سلطان کی شخصیت اور ان کی جدوجہد اقبال کے لئے بڑی پسندیدہ اور مثالی تھی۔ اقبال جب دسمبر 1928ء اور جنوری 1929ء کو جنوبی ہند کے سفر پر گئے تو میسور میں بالخصوص ٹیپو سلطانؒ شہید کے مزار پر حاضری دی تھی۔

علامہ اقبال نے مختلف معیاری علمی اداروں میں تحصیل علم کیا۔ جب علامہ اقبال یورپ میں ایرانی فلسفہ کے بارے میں تحقیق میں مصروف تھے تو انہیں بہت سی قیمتی کتب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

> ''اس زمانے میں ایرانی فلسفہ کے بارے میں مطبوعہ کتب کی کمی بھی تھی۔ اس کے باوجود انگلستان، فرانس اور جرمنی کے کتب خانے مطبوعات اور مخطوطات سے مالا مال تھے اور اقبال نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ جن مخطوطات کے اقبال نے اپنے مقالے میں حوالے دیئے ہیں ان میں سے اکثر برلن کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اقبال نے اصل عربی اور فارسی کتابوں کو پڑھا اور اپنے نتائج اخذ کئے مگر انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی کتابوں کے کئی حوالے بھی ان کے مقالے میں موجود ہیں۔ برصغیر کے تین چار مصنفوں کی کتابیں اقبال کے پیش نظر رہیں۔ مثلاً حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری (وفات 465ھ)، رسالہ خاتمہ از سید محمد گیسو دراز (وفات 825ھ) اور شیخ

محسن فانی کشمیری (وفات 1082ھ) سے منسوب دبستان المذاہب ان کے ماخذ میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علامہ شبلی نعمانی (وفات 1914ھ) کی اردو کتاب الکلام کے چار پانچ حوالے اپنے مقالے میں شامل کئے ہیں۔ اقبال نے دو فارسی شاعروں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ حکیم عمر خیام نیشاپوری (وفات 517ھ) کا ایک ہی حوالہ ہے مگر اقبال کے معنوی پیر و مرشد مولانا جلال الدین رومی (وفات 672ھ) کی مثنوی کے متعدد حوالے اور اس کتاب کے اشعار ''ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء'' میں منقول ملتے ہیں۔'' (13)

علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے مختلف انداز میں مولانا رومی کی بارگاہ میں گل ہائے عقیدت پیش نہ کئے ہوں۔ بالِ جبریل میں یوں کہتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ، کبھی پیچ و تابِ رازیؒ (14)

مولانا رومؒ اور شمس تبریزؒ کے ساتھ علامہ اقبال کی والہانہ عقیدت اور وابستگی ہے۔ علامہ اقبال اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں کوئی برہمن زادہ نہیں ملے گا جو روم و تبریز کے رموزِ تصوف سے باخبر ہو۔ انہوں نے مولانا رومؒ اور شمس تبریزؒ سے مکمل استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنے پر فخر کا اظہار یوں کیا ہے:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است (15)

علامہ اقبالؒ کو مشائخ عظام اور اولیائے کرام سے والہانہ محبت تھی۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں بڑے ادب اور احترام کے ساتھ اپنے محبوب صوفیہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جاوید نامہ میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ، حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کو اپنا خراج عقیدت پیش کرنے میں پیش پیش ہیں۔

علامہ اقبال جب انگلستان جا رہے تھے تو علامہ اقبالؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر تشریف لے گئے اور التجائے مسافر کے نام سے نظم پڑھی۔

علامہ اقبالؒ، حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی، شیخ فرید الدینؒ عطار، حضرت اویس قرنیؓ، حضرت شیخ بوعلی قلندرؒ، حضرت امیر خسروؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حضور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مولانا جلال الدینؒ اور شمس تبریزؒ کے علاوہ امام غزالیؒ، رازیؒ کو بھی شاندار الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ، حضرت شیخ حسام الحق ضیاء الدینؒ، شیخ فخر الدین عراقیؒ، شیخ محمود شبستریؒ، حضرت سید علی ہمدانیؒ، شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہی، حضرت سید محمد بابا تاج الدین ناگوریؒ، شاہ سلمان پھلواریؒ، حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ وغیرہ بزرگوں کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال اپنے اسلاف کی میراث کو اپنے لئے باعث صد افتخار گردانتے ہیں۔

علامہ اقبال نے یورپ کا سارا فلسفہ پڑھا۔ مشرقی افکار سے بھی بخوبی واقف تھے۔ بعض لوگ ان کے فکر کا ماخوذ فلسفہ یورپ کو قرار دیتے ہیں اور بعض نے افکارِ مشرق خاص کر رومی سنائی اور شبستری وغیرہ کو اہل دل کے مطابق فارسی شعرا کے تصورات کو علامہ کا سرچشمۂ فیض سمجھا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ علامہ نے فلسفہ یورپ سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ رومیؒ اور سنائیؒ سے بھی کسبِ فیض کیا۔ مگر ان کو ایک روشنی نے راہ دکھلائی۔ یہ روشنی قرآن حکیم کا فیض ہے اور یہی علامہ اقبال کے پیغام کی اساس ہے۔

علامہ اقبال نے صوفیائے کرام سے کسب فیض تو کیا مگر تقلید کورانہ سے پرہیز کی اور قرآنی بصیرت سے ہدایت لیتے ہیں اور اپنے اسلاف کی میراث کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے اسلاف کی میراث میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے لئے سرمایہ افتخار قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ جہاد، حرکت، عمل اور عشق رسول کو اپنا قیمتی سرمایہ گردانتے ہیں۔ علامہ اقبال علم وعقل سے فقر و عشق کو افضل ترین سمجھتے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے تصورات سے ان کی شاعری اور شخصیت کی غمازی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا اس کی اساس قرآن حکیم، عشق رسول اور میراثِ اسلاف ہے۔ علامہ اقبال نہ صرف پاکستان کے نقشہ میں اپنی فکر کے رنگ بھرنے کے لئے مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلاتے ہیں۔ اس کے لئے وہ متحد ہونے کا درس دیتے ہیں کیونکہ وہ مسلم تہذیب وثقافت کے علمبردار تھے۔

علامہ اقبال کی دیرینہ خواہش تھی کہ مسلم معاشرے کے قیام اور مسلم تہذیب وثقافت کے احیا کا اظہار ہو۔ وہ

اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجالے سے اس خطۂ سرسبز کو منور دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری اور فکر اسلامی اقدار کے فروغ کی علامت ہے۔

علامہ اقبال اسلاف کے تذکروں سے ملتِ اسلامیہ کے دل میں عشق رسولؐ کی شمع روشن کرنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام میں مایوسی و نامرادی کا کہیں نام ونشان نہیں۔ نہ دربان کی خوشامد پسندی ہے اور نہ ہی ریاکاری۔ حضرت علامہؒ، حضرت بایزیدؒ بسطامی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہوں نے خربوزہ (خربزہ) کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک تعمیرِ سیرت کے لئے شریعت کی پیروی بے حد لازمی ہے۔ ملت اسلامیہ کو قرآن پاک اور سیرت پاک سے گہری وابستگی رکھنی چاہیے اور احیائے دین کے لئے سیرت نبویؐ اور قرآن پاک کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کی میراث کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے، کیونکہ یہی ہماری ملت کی عظیم الشان عمارت کی اساس ہے اور یہی ملتِ رسول ہاشمیؐ کی پہچان ہے۔

اپنی امت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ (16)

ذیل میں ان اسلامی شخصیات کا مختصر تعارف دیا جاتا ہے جن کا علامہ اقبال کے کلام میں بہ تکرار ذکر آیا ہے۔ ان میں سرفہرست حضرت علیؓ کی شخصیت ہے۔ تاریخ اسلامی میں ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

باب مدینۃ العلم والعرفان حضرت علیؓ سرِخیل صوفیائے کرام ہیں۔ طریقت کے بہت سے سلسلے حضرت علیؓ سے شروع ہوتے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی علی، ابوالحسن اور ابوتراب کنیت، حیدر لقب تھا۔

علامہ اقبالؒ کو حضرت علیؓ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ علامہ اقبال نے ''اسرار و رموز'' میں جس عقیدت کا اظہار کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کلام کا ایک ایک شعر قاری کو اپنی طرف مدعو کرتا ہے۔ علامہ اقبال حضرت علیؓ سے محبت کا اظہار اس نظم میں یوں کرتے ہیں:

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ (کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرار و رموز)

علامہ اقبال نے حضرت امام حسینؓ کو ''بنائے لاالٰہ'' کہہ کر خراج تحسین ادا کیا ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر شہنشاہ ولایت حضرت خواجہ معین الدین چشتی پکار اٹھے:

شاہ است حسینؓ پادشاہ است حسینؓ
دین است حسینؓ دین پناہ است حسینؓ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لاالٰہ ہست حسینؓ

علامہ اقبال نے فلسفۂ شہادت امام حسینؓ کو یوں بیان کیا ہے :

اے صبا اے پیکِ دور افتادگان
اشک ما بر خاکِ پاکِ او رساں (کلیاتِ اقبال، فارسی)

ایک اور جگہ یوں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ، ابتداء ہے اسماعیلؑ (17)

علامہ اقبال کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے گہرا انس تھا۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ کے ہاں جاوید اقبال پیدا ہوئے تو علامہ اقبالؒ نے نذر مانی تھی کہ جب جاوید اقبال بڑے ہو جائیں گے تو ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر لے جائیں گے۔ چنانچہ 29 جون 1934ء کو وہ اپنے صاحبزادے جاوید اقبال کو سرہند لے کر گئے اور بارگاہِ حضرت مجدد الف ثانیؒ میں حاضری دے کر 30 جون 1934ء کو لاہور واپس آئے۔ مزار مبارک کی زیارت سے علامہؒ کے قلب پر جو اثر ہوا اس کے متعلق وہ اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد و شیریں ہے۔ سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا۔ جس کی بنیاد حضرت عمر بن العاصؓ نے رکھی تھی۔ اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت و آبادی میں دگنا ہے۔''

علامہ اقبال مجدد الف ثانیؒ سے گہری وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض عام ہو ساقی (کلیاتِ اقبال، اردو)

بال جبریل میں پنجاب کے پیرزادوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شان میں بیان کرتے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جُھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ مِلّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں ، لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار (کلیاتِ اقبال، اردو)

علامہ اقبال اپنے ایک مضمون علم ظاہر و باطن میں لکھتے ہیں:

''حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوّف شعارِ حقہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اگر تصوّف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ راقم الحروف اس تصوّف کو جس کا نصب العین شعارِ اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو عین اسلام جانتا ہے۔

''علامہ اقبال حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اُن کے نظریہ ہمہ از وست کے معترف ہیں۔ ان کے نظریہ خودی کا ماخذ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ ہمہ از وست ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ سالک کی آخری منزل عبدیت کو قرار دیتے ہیں۔ جہاں سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بندہ محض ہے، بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے۔''(18)

برصغیر پاک و ہند کے عظیم عالم، صوفی و درویش حضرت داتا صاحب ابوالحسن سیّد علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ ہیں۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے آخری دورِ حکومت میں لاہور تشریف فرما ہوئے۔ آپ کی تشریف آوری لاہور کی تاریکیوں کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ آپ نے اپنی تجلیات سے جہالت کے اندھیروں میں روشنی کا سا کام لیا۔ آپ کی بدولت بہت سے غیر مُسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست کی طرف گامزن کیا۔

علامہ اقبال جیسے درویش بھی آپ کی علمی و دینی خدمات کے معترف ہیں:

سیّدِ ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم (کلیاتِ اقبال، فارسی)

حضرت داتا گنج بخشؒ کے والد محترم کا نام سیّد عثمان ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسن سے جا ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے مثنوی اسرار و رموز میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو انہوں نے فرمایا کہ: ایک نوجوان کُرد سے حضرت داتا گنج بخشؒ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں دشمنوں کی یلغار میں گھرا ہوا ہوں مجھے دشمنوں میں زندگی بسر کرنے کا کوئی طریقہ بتایئے؟

آپ نے فرمایا اے زندگی کے راز اور آغاز و انجام سے ناواقف زندگی کا راز یہ ہے کہ دشمنوں کے اندیشہ ہائے دور و دراز سے بے نیاز ہو کر اپنی خوابیدہ قوتوں کو محسوس کرو۔ اس کو مثلاً یوں سمجھو کہ اگر پتھر اپنے آپ کو شیشہ سمجھنے لگے تو وہ رفتہ رفتہ شیشہ ہو جائے گا اور یقیناً گر کر ٹوٹے گا۔ اگر کوئی مسافر اپنے میں خود کمزوری محسوس کرنے لگے تو وہ یقیناً رہزنوں کے ہاتھوں لٹے گا۔ تم کب تک اپنے آپ کو پانی اور مٹی سمجھتے رہو گے۔

''اپنی مٹی سے شعلہ طور پیدا کرو۔ یاد رکھو جس نے مقام خودی کو پہچان لیا ''دفضل حق'' اس کے شامل حال ہو گا۔ خواہ اس کا دشمن کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔ اگر تم اپنے آپ کو خودی سے مزین کر لو گے تو ایک جہاں کو شکست دے سکتے ہو۔ یاد رکھو بقا اس کا مقدر ہے جو اپنی خودی کو بیدار کرتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خود سے غفلت اور بیگانگی قوت ہے۔ جس میں خودی کا جذبہ مردہ ہو گیا تو وہ مر چکا۔ تمہیں پتہ ہے کہ موت و حیات میں کیا فرق ہے؟ خودی کے عرفان میں تمہیں حضرت یوسفؑ کی طرح ہونا چاہیے تا کہ ابتری سے شہنشاہی کے مرتبے کو پہنچو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور عاقبت اندیش انسان بنو تا کہ تم بھی مردان حق اور

حاصل اسرار لوگوں میں جگہ پا سکو۔'' (19)

حضرت جنید بغدادیؒ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جن سے علامہ اقبالؒ کو غیر معمولی محبت وعقیدت تھی۔ اور جنہیں وہ اپنی شاعری میں بطور نمونہ ومثال پیش کرتے ہیں:

بال جبریل میں ان کی ایک نظم ''ذوق وشوق'' کے عنوان سے ہے۔اس میں فقر جنید کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں:

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

(کلیاتِ اقبال، اردو، بال جبریل)

ارمغان حجاز میں بھی علامہ اقبالؒ نے حضرت جنیدؒ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جن صوفیائے کرام سے بے پناہ عقیدت اور احترام کا اظہار کیا ہے ان میں سے معروف صوفی وعالم امام غزالیؒ بھی ہیں۔علامہ اقبالؒ ان کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ :

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو ، غزالیؒ ہو
کچھ کام نہیں آتا بے آہ سحر گاہی (کلیاتِ اقبال، اردو)

ایک اور جگہ ارمغان حجاز میں امام غزالیؒ کی عالمانہ عظمت اور ان کے مراتب عالی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دل جنیدؒ و نگاہ غزالیؒ و رازیؒ

(کلیاتِ اقبال، فارسی، ارمغان حجاز)

حضرت اویس قرنیؓ کا شمار تابعین اور طبقہ اول کے صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ وہ عاشق رسول ﷺ تھے انہوں نے اپنے علم اور تدبر سے محبت الٰہی اور عشق رسولؐ سے قلوب انوار وتجلیات سے روشناس کیا۔رسول اکرم ﷺ نے حضرت اویسؓ کے متعلق فرمایا کہ اویسؓ کے متعلق فرمایا کہ اویس احسان ومہربانی کے اعتبار سے بہترین تابعین میں سے ہیں۔بعض مرتبہ آپ ﷺ یمن کے جانب رخ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ:

''میں یمن کی جانب سے رحمت کی ہوا آتی ہوئی پاتا ہوں''

علامہ اقبالؒ حضرت اویس قرنیؓ کے بے حد عقیدت مند تھے، انہوں نے فرمایا:

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویسؓ طاقت دیدار کو ترستا تھا
عشق عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسم سلمانؓ و اویس قرنیؓ کو چھوڑا (کلیاتِ اقبال، اردو)

علامہ اقبال کے اردو مجموعہ کلام میں ہمیں اویس قرنیؓ کی والہانہ عقیدت میں جو اشعار ملتے ہیں وہ علامہ اقبال کی حضرت اویس قرنیؓ کے ساتھ گہری وابستگی کے عکاس ہیں۔

''علامہ اقبالؒ کو مولانا رومیؒ سے گہری عقیدت تھی۔ ان کے کلام پر مولانا رومیؒ کے افکار اور تصوّف کا گہرا اثر ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے ظاہری تعلیم تربیت کے تمام مراحل بحسن وخوبی انتہائی ارفع واعلیٰ درجات میں طے کیے، جس کی بنا پر علمی حلقوں میں آپؒ کو انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عمل اور قول کے ساتھ فعل کی بلندیوں پر فائز تھے۔ آپؒ کا درس تشنگانِ علم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ علامہؒ نے مولاناؒ کی تعلیمات کو حرزِ جاں کی طرح عزیز رکھا۔''(20)

حضرت شمس تبریزؒ علامہ اقبال کے مرشد معنوی مولانا رومؒ کے پیر ہیں۔ ایک مرید کو اپنے پیر سے جو عقیدت اور چاہت ہوسکتی ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ علامہ اقبال نے ''زبورِ عجم'' میں مولانا روم اور حضرت شمس تبریزؒ سے عقیدت کا اظہار ہے۔ علامہ اقبالؒ حضرت تبریزؒ سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی (کلیاتِ اقبال، اردو، زبورِ عجم)

علامہ اقبال بواسطت مولانا روم خود حضرت شمس تبریزؒ کے تصوّف کے قائل ہیں اور بالواسطہ ان سے اکتساب فیض کیے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کو حضرت میاں میرؒ سے بھی گہری عقیدت اور محبت تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں آپ سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسرار ورموز میں علامہ اقبال برصغیر پاک وہند کے مشہور بزرگ حضرت میاں میرؒ

کے بارے میں فرماتے ہیں:

حضرت شیخ میاں میر ولی
ہر خفی از نورِ جان او جلی
برطریق مصطفیٰ محکم پئے
نغمۂ عشق و محبت را نئے
تربتش ایمانِ خاکِ شہرِ ما
مشعلِ نور ہدایت پیرِ ما

(کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرار ورموز، ص:63)

حضرت میاں میرؒ نے پنجاب کی سرزمین کو اپنے رشد وہدایات سے فیض یاب کیا اور بھٹکے اور بھولے ہوئے انسانوں کو نیکی کی راہ پر چلایا۔(21)

حضرت امیر خسروؒ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کے سوز وگداز سے متاثر ہو کہ علامہ اقبال نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں انہی نعمتوں کے خزانے سے سوز خسروؒ عطا فرمائے۔ارمغان حجاز میں اس عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عطا کن شور رومیؒ سوز خسروؒ
عطا کن صدق و اخلاص سنائیؒ (کلیاتِ اقبال، فارسی)

حضرت امیر خسروؒ کا نام ابوالحسن لقب یمین الدین اور تخلص خسرو ہے ان کے والد محترم امیر سیف الدین محمود ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے ہیں۔

اس مختصر تعارف نامے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اقبال کو اولیائے اللہ سے کس درجہ عقیدت تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تخلیقی وجدان کو انہی صوفیہ کی تعلیمات نے متاثر کیا، اسی لئے ان کی شاعری الوہی صفات کی حامل ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1- محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، اسرار ورموز، رموز بے خودی، (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1976ء، ص:166)

2- جلال الدین محمد، رومی، مثنوی مولانا رومؒ، دفتر اوّل (لاہور، الفیصل ناشران، ص:29)

3- نذیر احمد ظفر چیمہ، میجر، گلِ فارسی، حصہ اول، (لاہور، جہانگیر بک ڈپو، اُردو بازار، 2001ء، ص:7)

4- نذیر احمد ظفر چیمہ، میجر، گلِ فارسی، حصہ اول (ص:8)

5- طالب حسین، سیال، فکر اقبال میں شخصیت کا تصوّر، مضمون مشمولہ، دانش اقبالؒ کے چند پہلو (اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2006ء، ص:8)

6- طالب حسین، سیال، فکر اقبال میں شخصیت کا تصوّر، مضمون مشمولہ، دانش اقبالؒ کے چند پہلو (ص:11)

7- محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، جاوید نامہ، حلاّج، (لاہور، اقبال اکادمی 1982ء، ص:149)

8-- اسعد گیلانی، سیّد، تصوّراتِ اقبال، (لاہور، فیروز سنز، 1991ء، ص:45)

9- صدیق جاوید، ڈاکٹر، اقبالیاتِ راوی (لاہور، الفیصل ناشران، 1989ء، ص:95)

10- ابوالحسن ندوی، مولانا، سید، اقبال دردِ دولت پر (کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1972ء، ص:246)

11- ابوالحسن علی ندوی، نقوشِ اقبال، (کراچی، مجلس نشریات اسلام، 1975ء، ص:61)

12- کلیات اقبال (اردو، ص)

13- نورین تحریم بابر، کورس رابطہ کار، علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ، یونٹ 10 تا 18 (اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2001ء، ص:72)

14- کلیاتِ اقبال، اردو (ص:351)

15- کلیات اقبال، فارسی (ص:405)

16- کلیاتِ اقبال، اردو (مذہب)، (اکادمی، 2000ء، ص:277)

17- شاہد سلیم محمد، علامہ اقبال کے ہر دلعزیز صوفیائے کرام، (لاہور، ہفت روزہ فیملی)، 11، 17 نومبر 2007ء، ص:9)

18- شاہد سلیم محمد، علامہ اقبال کے ہر دلعزیز صوفیائے کرام، (لاہور، ہفت روزہ فیملی، ص:9)

19- ایضاً (ص:9)

20- ایضاً (ص:9)

21- ایضاً (ص:9)

باب چہارم

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے ذہنی روابط

مولانا رومؒ (مولانا جلال الدین محمد) بن سلطان العلماء بہاءالدین محمد بن حسین الخطیبی ایران کے متصوف شعراء میں سے جلیل القدر شاعر ہیں۔ وہ بلخ میں 604ھ (8-1207ء) میں پیدا ہوئے اور 672ھ (17 دسمبر 1273ء کو) قونیہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اُن کے والد محترم محمد بن حسین ملقب بہ بہاءالدین اپنے دور کے اکابر علماء و مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ (1) کے خلفا میں سے تھے اور سلطان علاؤ الدین خوارزم شاہ کے مزاج میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ پند و موعظت کی وجہ سے جہاں ان کو غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے چند مخالف بھی سامنے آ گئے جنہوں نے ان کے لیے بے حد مسائل کھڑے کر دیئے۔ لہذا انہوں نے تنگ آ کر بلخ سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اور بغداد کے راستے اپنے صاحبزادے مولانا جلال الدین رومی (اس وقت مولانا کی عمر 14 سال کی تھی) کے ساتھ حج کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔ غالباً یہ سفر 617ھ (21-1220ء) میں اختیار کیا گیا۔

بہاءالدین محمد اپنے سفر کے دوران جہاں کہیں سے بھی گزرتے۔ عوام الناس آپ کی زیارت کو آتے۔

''جب آپ نیشاپور پہنچے تو حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو اپنے سینے سے لگا لیا اور اُن کے والد سے کہا کہ اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا، پھر اپنی مثنوی ''اسرار نامہ'' مولانا روم کو دی، پھر آپ بغداد گئے۔ اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر ملاطیہ (2) پہنچے اور اس شہر میں سنجوقیوں کا دارالحکومت تھا، اس شہر میں آپ نے سات سال قیام کیا۔ پھر سلطان علاءالدین کیقباد (617-634ھ) کی دعوت پر آپ اس کے دارالحکومت قونیہ تشریف لے گئے، اور وہاں سلطان العلماء بہاالدین جو علوم ظاہر و باطنی میں بلند مقام رکھتے تھے، درس و تدریس، ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے۔ علاؤ الدین کیقباد آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ بہاءالدین نے جمعہ کے روز۔ 18 ربیع الثانی 628ھ (1231ء) کو وفات پائی۔'' (3)

مولانا جلال الدین رومی نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ اُن کی وفات کے بعد اپنے والد کے مرید سید برہان الدین محقق ترمذی (4) جو اُس زمانے میں قونیہ آئے ہوئے تھے اور اکابر اولیاء اور اہل طریقت میں تھے، اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر اکتسابِ فیض کیا اور پورے نو سال اس مرد حق آگاہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے اور اکثر علوم و فنون اُن سے حاصل کیے۔

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی زمانے میں مولانا رومؒ اُن کے مرید ہو گئے تھے۔

سوانح مولانا روم میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد مولانا روم نے حلب جانے کا ارادہ کیا۔ حلب اس زمانے میں دمشق کی طرف مدینۃ العلم بن چکا تھا۔ حلب پہنچ کر مدرسۂ حلاویہ کے دارالاقامہ میں قیام کیا۔ مولانا مدرسۂ حلاویہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی تعلیم حاصل کی۔''(5)

''مناقب العارفین میں ہے کہ حلب کے بعد مولانا روم دمشق آ گئے وہاں کے علماء اور اکابر نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور مدرسۂ مقدسہ میں لے کر آئے۔ مولانا روم دمشق میں تقریباً سات سال تک علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول رہے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال کی تھی۔''(6)

علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد مولانا دمشق سے پھر قونیہ تشریف لے آئے۔ اس وقت مولانا روم پر ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا۔ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، وعظ کہتے تھے۔ فتویٰ لکھتے تھے اور سماع وغیرہ سے احتراز کرتے تھے۔ اور بڑے تزک و احتشام سے رہتے تھے۔ 642ھ میں حضرت شمس الدین تبریزی نام کے ایک درویش سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات نے نہ صرف مولانا کی زندگی کا رنگ ہی تبدیل کر دیا بلکہ رومی کی کایا پلٹ دی۔ علامہ شبلی نے حضرت شمس تبریز کی مولانا سے ابتدائی ملاقات کے واقعات کو مختلف تذکروں سے یکجا کر کے یوں بیان کیا ہے:

جواہر مضیہ میں نقل ہے کہ ایک دن مولانا روم گھر میں تشریف رکھتے تھے، آپ کے شاگرد ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے، اتفاقاً حضرت شمس تبریزی کسی طرف سے آ نکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے، اور مولانا سے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہے (''این چیست''؟) مولانا نے فرمایا (''این آنست کہ شما نمی دانید'') یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ کہنا تھا کہ تمام کتابوں کو آگ لگ گئی۔ مولانا رومؒ نے کہا یہ کیا ہے؟۔ حضرت شمس تبریز نے جواب دیا: ''یہ وہ ہے جو تم نہیں جانتے۔ یہ کہہ کر حضرت شمس تبریز چل دیئے۔ اس واقعہ کے بعد مولانا کا یہ عالم ہو گیا کہ گھر بار، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر قریہ بہ قریہ نکل کھڑے ہوئے اور ملک بہ ملک، کُو بہ کُو حضرت شمس تبریز کو تلاش کرتے رہے۔ لیکن کہیں بھی حضرت شمس تبریز نہ مل سکے۔

زین العابدین شروانی نے مثنوی مولانا رومؒ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ حضرت شمس الدین تبریز کو اُن کے پیر بابا کمال جندی(7) نے حکم دیا تھا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔ لہٰذا حضرت شمس تبریز

قونیہ پہنچے اور شکر فروشوں کی کارواں سرائے میں اُترے۔ ایک دن جبکہ مولانا روم کی سواری بڑے تزک واحتشام سے نکلی، حضرت شمس تبریز نے سرراہ ان کو روک کر پوچھا ''مجاہدہ و ریاضت کا کیا مقصد ہے؟ مولانا نے کہا ''اتباعِ شریعت''، شمس تبریز نے کہا ''یہ تو سب جانتے ہیں۔''

مولانا نے کہا ''اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے۔'' حضرت شمس تبریز نے فرمایا ''علم کے معنی یہ ہیں کہ تم کو منزل تک پہنچائے'' پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار (حکیم سنائی)

مولاناؒ پر ان جملوں کا یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت حضرت شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

علامہ اقبالؒ نے اسرار و رموز میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال
جست راہ مکتب ملا جلال
گفت ایں غوغائے قیل و قال چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست

(کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرار و رموز)

.....

مولوی فرمود ناداں لب بہ بند
بر مقالاتِ فرومنداں مخند

ایک اور روایت میں ہے کہ مولانا روم حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت شمس تبریز نے پوچھا کہ یہ کیا ہیں۔ مولانا نے کہا ''یہ قیل و قال ہے، تمہیں اس سے کیا غرض؟'' حضرت شمس تبریز نے تمام کتابیں اُٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو نہایت رنج ہوا اور کہا کہ میاں درویش! تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جو اب کسی طرح نہیں مل سکتیں۔ حضرت شمس نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں نکال کر کنارے پر رکھ دیں لطف یہ کہ ساری کتابیں اسی طرح خشک تھیں اور کسی کتاب پر ذرا بھی نمی نہیں آئی تھی (نمی کا نام بھی نہ تھا)۔ مولانا پر سخت حیرت طاری ہوئی۔ حضرت شمس تبریز نے فرمایا کہ ''یہ حال کی باتیں ہیں، تم ان کو کیا

جانو'! اس کے بعد مولانا اُن کے ارادت مندوں داخل ہو گئے۔

یہ اور اس کی قسم کی متعدد روایات تاریخ اور تذکروں میں ملتی ہیں۔ ابن بطوطہ جب سفر کرتے کرتے قونیہ پہنچا تو مولانا کی قبر کی زیارت کی تقریب سے مولانا کا کچھ حال لکھا ہے اور حضرت شمس تبریز سے ملاقات کی روایت کو یوں بیان کیا ہے:

> ''مولانا اپنے مدرسے میں درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک شخص حلوہ بیچتا ہوا مدرسے میں آیا۔ حلوے کی اس نے قاشیں بنالی تھیں اور ایک ایک پیسے کو ایک ایک قاش بیچتا تھا۔ مولانا نے ایک قاش لی اور تناول فرمائی۔ حلوہ دے کر وہ تو کسی طرف نکل گیا، ادھر مولانا کی یہ حالت ہوئی کہ بے اختیار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خدا جانے کدھر چل دیئے۔ برسوں کچھ پتہ نہ چلا۔ کئی برس کے بعد آئے تو یہ حالت تھی کہ کچھ بولتے چالتے نہ تھے۔ جب کبھی زبان کھلتی تو شعر پڑھتے تھے۔ ان کے شاگرد ان شعروں کو لکھ لیا کرتے تھے۔ یہی اشعار تھے جو جمع ہو کر مثنوی بن گئی۔'' یہ واقعہ لکھ کر ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ان اطراف میں اس مثنوی کی بڑی عزت ہے۔ لوگ اس کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور اس کا درس دیتے ہیں۔ خانقاہوں میں شبِ جمعہ معمولاً اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔''(8)

حضرت شمس تبریز اور مولانا روم کی ملاقات کے بارے میں جو روایتیں نقل ہوئی ہیں ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں (مثلاً جواھر مضیۂ) بعض اور تذکروں میں منقول ہیں۔ مولانا شبلی نے ان روایات کے سلسلے میں ذکر کیا ہے کہ سپہ سالار مولانا روم کے خاص شاگرد تھے۔ انہوں نے چالیس برس تک فیض صحبت اُٹھایا تھا۔ سپہ سالار نے مولانا روم سے حضرت شمس(9) تبریز کی ملاقات کا جو حال لکھا ہے سادہ، صاف اور بالکل قرینِ عقل ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت شمس تبریز نے ایک دفعہ مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الٰہی! کوئی ایسا بندۂ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا۔ عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ۔ اُسی وقت چل کھڑے ہوئے۔ قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ برنج فروشوں کی سرائے میں اترے۔ سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترہ تھا۔ اکثر امراء اور عمائدین شہر اس چبوترے پر آ کر بیٹھتے تھے۔ حضرت شمس بھی اُسی چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کو جب حضرت شمس کی آمد کی خبر ملی تو آپ حضرت شمس تبریز کی ملاقات کو آئے۔ راہ میں لوگ قدم بوس ہوتے جاتے تھے۔ اسی شان سے سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ حضرت شمس تبریز نے آپ کو دیکھتے ہی ایک نظر میں سمجھ لیا کہ یہ وہی شخص

ہے جس کے متعلق بشارت ہوئی ہے۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبانِ حال میں باتیں ہوتی رہیں حضرت شمس تبریز نے مولانا سے پوچھا کہ حضرت بایزید بُسطامی کے ان دو واقعات میں تطبیق کیوں کر ہوسکتی ہے کہ ایک طرف تو یہ حال ہے کہ تمام عمر اس خیال سے خربزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو کسی طرح کھایا ہے، دوسری طرف اپنی نسبت یوں فرماتے تھے کہ ''سبحانی ما اعظم شانی'' (یعنی اللہ اکبر! تیری شان کس قدر بڑی ہے)۔ حالانکہ رسول اللہ صلعم باایں ہمہ جلالتِ شان فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں 70 دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ بایزید اگرچہ بہت بڑے پائے کے بزرگ تھے لیکن مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجے پر ٹھہر گئے تھے اور اس درجے کی عظمت کے اثر سے ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے، بخلاف اس کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منازلِ تقرب میں برابر ایک پائے سے دوسرے پائے پر چڑھتے جاتے تھے، اس لیے جب بلند پائے پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا تھا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔

مولانا روم کے شاگرد خاص سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب (10) کے حجرے میں چلّہ کش رہے۔ کسی کو اس حجرے میں آمد رفت کی مجال نہ تھی۔ حضرت شمس کی صحبتوں سے مولانا میں ایک تغیّر عظیم پیدا ہوا۔ مولانا جو قبل ازیں سماع سے محترز رہتے تھے، اب اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ چونکہ مولانا نے درس و تدریس اور وعظ و پند کے اشغال دفعتہً چھوڑ دیئے (چلہ کشی کے دوران آب و غذا قطعاً متروک تھی اور بغیر صلاح الدین کے اور کسی کو حجرے میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی)۔ مولانا حضرت شمس کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہ ہوتے تھے۔ تمام شہر میں ایک شورش مچ گئی۔ مولانا کی طبیعت میں اس انقلاب کو دیکھ کر حضرت شمس تبریز کے خلاف لوگوں میں شورش پیدا ہوئی، اور آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایک دیوانۂ بے سروپا نے مولانا پر ایسا سحر کر دیا کہ وہ کسی کام کے نہیں رہے۔ یہ برہمی یہاں تک پھیلی کہ خود مریدانِ خاص بھی اس کی شکایت کرنے لگے۔ حضرت شمس تبریز نے اس شورش کو بھانپ لیا۔ اور چپکے سے قونیہ سے نکل کر دمشق چلے گئے۔ مولانا کو اُن کے فراق کا ایسا صدمہ ہوا کہ سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ مریدانِ خاص کو بھی خدمت میں بار نہیں مل سکتا تھا۔ مدت کے بعد حضرت شمس تبریز نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا۔ اس خط نے شوق کی آگ اور بھڑکا دی۔ مولانا روم نے اس زمانے میں نہایت رقت انگیز اور پُر اثر اشعار کہے۔ جن لوگوں نے شمس کو آزردہ کیا تھا، ان کو سخت ندامت ہوئی۔ سب نے مولانا سے آکر معافی کی درخواست کی۔ چنانچہ اسی واقعے کو مولانا کے صاحبزادے سلطان

ولد نے اپنی مثنوی میں درج کیا ہے:

همه گریاں ، به توبه گفته که وائے
عفو ما کن ازیں گناه ، خدائے
قدرِ اُو از علمی نه دانستیم
که بُد او پیشوا نه دانستیم
طفلِ ره بوده ایم، خرده مگیر
یارب انداز در دل آں پیر
که کند عذر هائے مارا اُو
عفو کلی ازیں شیدیم دو تو
پیش شیخ آمدند لابه کناں
که به بخشا ، مکن دگر هجراں
توبه ها می کنیم ، رحمت کن
گرد گر این کنیم ، لعنت کن
شیخ شاں چونکه دید ازیشاں ایں
راه شاں داد رفت ازو آں کیں

اب یہ رائے قرار پائی کہ سب مل کر دمشق جائیں اور حضرت شمس تبریز کو ساتھ لے کر آئیں۔ سلطان ولد اس قافلے کے سپہ سالار رہے۔ مولانا نے شمس تبریز کے نام ایک منظوم خط لکھا اور سلطان ولد کو دیا کہ خود پیش کرنا ،اور ساتھ میں تحائف بھی لے کر گئے۔ سلطان ولد قافلے کے ساتھ دمشق پہنچے بڑی مشکل سے حضرت شمس تبریز کا پتہ لگا۔ سب سامنے جا کر آداب و تسلیم بجالائے اور پیش کش، جو ساتھ لائے تھے، نذر کر کے مولانا کا منظوم خط دیا۔ شمس مسکرائے:

به دام و دانه نگیرند مُرغِ دانا را

پھر فرمایا کہ ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں، مولانا کا پیام کافی ہے چند روز تک اس سفارت کو مہمان رکھا۔ پھر دمشق سے سب کو لے کر روانہ ہوئے۔ تمام لوگ سواریوں پر تھے، لیکن سلطان ولد کمال ادب سے حضرت

شمس کے رکاب کے ساتھ دمشق سے قونیہ تک پیادہ آئے۔ مولانا کو خبر ہوئی تو تمام مریدوں اور حاشیہ بوسوں کو ساتھ لے کر استقبال کو نکلے اور بڑے تزک و احتشام سے لائے۔ مدت تک بڑے ذوق و شوق کی صحبتیں رہیں۔

''افلاکی کے قول کے مطابق رومی نے شمس سے خط و کتابت کے دوران میں چار غنائی نظمیں لکھیں۔ ایک عربی میں تھی اور باقی فارسی میں۔ لیکن شبلی لکھتے ہیں کہ رومی نے شمس کے نام ایک منظوم خط لکھا۔ اس کے علاوہ ایک غزل بھی پندرہ شعروں کی لکھی تھی جس کے دو شعر دیباچۂ مثنوی میں نقل کیے ہیں۔''(11)

بروید اے حریفاں ! بکشید یار مارا
بمن آورید حالا، صنم گریز پا را
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دمِ دگر بیاید
مخورید مکر او را ، بفریبد او شمارا

استاد بدیع الزماں فروزانفر کے قول کے مطابق یہ غزل رومی نے سلطان ولد کی شام روانگی کے وقت پڑھی جہاں وہ شمس کو منا کر قونیہ واپس لانے کے لیے جا رہا تھا۔ استاد فروزانفر نے ایک اور شعر بھی شامل کیا ہے۔

بہ بہانہ ہائے شیریں بہ ترانہ ہائے موزوں
بکشید کوئے خانہ مہ خوب خوش لقارا

سلطان ولد اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور 1247ء میں شمس کو ساتھ لیے واپس آ گیا۔ واپسی کے سفر میں سلطان ولد کمال ادب سے پیدل آیا جبکہ شمس گھوڑے پر سوار تھا۔ شاید رومی کی ہدایات کے مطابق ایسا کیا گیا ہو۔ بہر حال دوبارہ ملاقات سے رومی کو ایسی مسرت حاصل ہوئی جو احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی۔ اُن کے جن مریدوں کی وجہ سے شمس چلے گئے تھے۔۔۔ انہوں نے معافی مانگی اور رومی کو یقین دلایا تھا کہ اگر شمس لوٹ آئے تو قطعاً اعتراض نہیں کریں گے۔

توبہ ہا می کنیم رحمت کن — گر دگر ایں کنیم لعنت کن
توبۂ ما بکن زلطف قبول — گرچہ کردیم جُرمہا ز فضول

چند روز کے بعد حضرت شمس تبریز نے مولانا کی ایک پروردہ جس کا نام کیمیا تھا، شادی کر لی۔ مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کرا دیا کہ حضرت شمس اس میں قیام فرمائیں۔ مولانا کے ایک صاحبزادے جن کا نام علاء الدین چلپی تھا، جب مولانا سامنے آتے تو حضرت شمس کے خیمے میں سے ہو کر جاتے۔ حضرت شمس تبریز کو یہ

بات پسند نہ آتی تھی۔ انہوں نے چند بار منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئے۔ علاء الدین نے لوگوں سے شکایت شروع کر دی۔ حاسدوں کو موقع ملا، اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کیا غضب ہے! ایک بیگانہ آئے اور یگانوں کو گھر میں نہ آنے دے۔ یہ چرچا عام ہوا، یہاں تک کہ حضرت شمس تبریز نے عزم کر لیا کہ وہ اس مرتبہ جا کر پھر کبھی نہ آئیں گے، چنانچہ وہ دفعتاً غائب ہو گئے۔ مولانا نے ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر تمام مریدوں اور عزیزوں کو ساتھ لے کر خود تلاش کو نکلے۔ دمشق میں قیام کر کے ہر طرف سراغ رسانی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر قونیہ واپس چلے آئے۔ یہ واقعہ شعبان 645ھ (48-1247ء) میں پیش آیا۔

نفحات الانس اور دیگر تذکروں میں ہے کہ مولانا روم کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے، جن میں اُن کے صاحبزادے علاء الدین بھی شریک تھے، حضرت شمس تبریز کو شہید کر دیا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ پہلی روایت کہ حضرت شمس تبریز دوبارہ غائب ہو گئے، زیادہ صحیح اور قرین قیاس ہے۔

حلب اور دمشق سے تحصیل علوم کر کے مولانا روم قونیہ آئے۔ اور یہاں آ کر اپنے والد کی طرح تعلیم و تدریس اور علوم شریعہ کے پھیلانے میں مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ ایک شخص نے باہر سے آ کر اُن کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب پیدا کیا۔ یہ بزرگ شمس الدین بن علی بن ملک داؤد تبریزی تھے، جو پیرانِ صوفیہ میں تھے۔ اُن کے نفس گرم میں ایک عجیب تاثیر تھی۔ وہ ایک عظیم جذبہ اور اپنی گفتگو میں ایک عجیب تاثیر رکھتے تھے۔ مختلف شہروں میں گھومنا، اور اہل راز کے ساتھ ریاضت اور درویشوں اور عارفوں کے ساتھ اُنس و محبت اُن کا خاص شعار تھا۔ یہاں تک کہ 642ھ (45-1244ء) میں یہ مولانا روم کی تلاش میں قونیہ آئے، اور مولانا کے چہرے میں عشق و حقیقت کی تجلیات کو محسوس کر کے اُن کو اپنا شیفتۂ معنوی بنا لیا، اور اُن کی روحانی مرشد اور قائد بنے۔ مولانا کو جو عقیدت اور بے پایاں محبت حضرت شمس تبریز سے تھی، اس کا اندازہ مولانا کے اشعار اور اقوال سے ہوتا ہے۔ مولانا کا مثنوی معنوی کے دفتر اول میں یوں مرقوم ہے:

شمس تبریزی کہ نورِ مطلق ست
آفتاب ست وز انوارِ حق ست
ایں نفس جاں دامنم بر تافت ست
بوائے پیراہانِ یوسف یافت ست

کز برائے حقِ صحبت سالہا
باز گو رمزے ازاں خوش حالہا
من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست
شرح آں یارے کہ آن را یار نیست

.....

خوش تر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں
گفتہ آید درِ حدیثِ دیگراں
شرحِ ایں ہجران و ایں خونِ جگر
ایں زماں بگزار تا وقتِ دگر
گفتمش پوشیدہ ، خوشتر سِرِّ یار
خود تو در ضمن حکایت گوش دار (مثنوی مولانا روم)

مولانا کے درج بالا کلام سے عین واضح ہے کہ مولانا روم نے مثنوئ مولوئ معنوی کی حکایات کے تذکرے اور تصوّف کے رموز واسرار بیان کرنے میں حضرت شمس تبریز کے تصوّف کو برابر پیش نظر رکھا ہے۔ اگر چہ وہ اُن کا نام نہیں لیتے لیکن وہ سِرِّ دلبراں دراصل حدیثِ دیگراں میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل شمس تبریز کی صحبت نے مولانا کی کایا پلٹ دی تھی اور اُن کی زندگی میں عشق کی نئی شمع روشن ہوگئی تھی۔

کہتے ہیں کہ حضرت شمس تبریز پر وجد وشوق کا غلبہ تھا اور غلبۂ حال کی وجہ سے اندرونی مضمرات کے چھپانے پر قادر نہ تھے۔ اور وہ اسرار کو فاش کرتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ اُن کے زیادہ مخالف ہو گئے۔ اور 645ھ (1247-48ء) میں قونیہ کے عوام نے ان پر حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا اور اس حادثے میں مولانا کے صاحبزادے علاءالدین بھی شدید زخمی ہوئے۔ لیکن مولانا کی غزلیات سے جو اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شمس تبریز ایک روز غائب ہوگئے۔ مولانا دوسال شب وروز اُن کو تلاش کرتے رہے لیکن کہیں اُن کا پتہ نہ چلا۔

مولانا کے سلسلۂ باطنی کا نام جلالیہ یا مولویہ ہے۔ حضرت شمس کی جدائی نے مولانا کو ایک مدت تک بے قرار و بے تاب رکھا۔ ایک دن اسی جوش وخروش کی حالت میں گھر سے نکلے۔ راہ میں صلاح الدین زرکوب کی دکان تھی۔ وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ مولانا پر ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر کیا۔ وہیں کھڑے ہوگئے اور

وجد کی حالت طاری ہوگئی۔ شیخ، مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے، یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضائع ہوگئی لیکن انہوں نے ہاتھ نہ روکا۔ آخر شیخ باہر نکل آئے۔ مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور اس جوش و مستی میں دوپہر سے عصر تک یہ شعر گاتے رہے:

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکان زرکوبی
زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

صلاح الدین زرکوب وہیں مولانا کے مرید ہوگئے۔ اپنی دکان لٹادی اور مولانا کے ساتھ ہوگئے۔ وہ نو برس تک مولانا روم کے ہمراز و ہمدم رہے۔ مولانا کی کم از کم اکہتر غزلوں میں صلاح الدین زرکوب کا ذکر ملتا ہے۔ شمس تبریز کی مفارقت نے رومی پر ایک قیامت ڈھادی تھی۔ زرکوب کی دوستی اور خلوص مندی نے بڑی تسکین و راحت بخشی۔ مولانا اُن کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے جس طرح مرید پیر کے ساتھ۔ اس رویے سے بھی سخت شورش برپا کی۔ مولانا نے اپنے صاحبزادے سلطان ولد کا شیخ صلاح الدین کی صاحبزادی سے عقد بھی کر دیا تھا تاکہ اختصاص باطنی کے ساتھ ظاہری تعلقات بھی مستحکم ہو جائیں۔ بقول سپہ سالار دس برس تک مولانا اور شیخ کی صحبتیں گرم رہیں۔ بالآخر 664ھ میں شیخ بیمار ہوئے اور مولانا سے درخواست کی کہ دعا فرمایئے کہ اب طائر روح قفسِ عنصری سے نجات پائے۔ تین چار روز بیمار رہ کر وفات پائی۔ مولانا نے تمام رفقا اور احباب کے ساتھ ان کے جنازے میں شامل ہوئے اور انہیں اپنے والد کے مزار کے پہلو میں دفن کیا۔ مولانا نے شیخ کی جدائی میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

ای ز ہجراں در فراقت آسماں بگریستہ
درمیانِ خوں نشستہ، عقل و جاں بگریستہ

شیخ صلاح الدین زرکوب کی وفات کے بعد مولانا نے حسام الدین چلپی کو، جو معتقدانِ خاص میں تھے، ہمدم و ہمراز بنایا اور جب تک زندہ رہے انہیں سے دل کو تسکیں دیتے رہے۔ مولانا اُن کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے کہ لوگوں کو گمان ہوتا تھا کہ شاید اُن کے مرید ہیں۔ وہ بھی مولانا کا اس قدر ادب کرتے تھے کہ پورے دس برس کی مدت میں ایک دن بھی مولانا کے وضو خانے میں وضو نہیں کیا۔ شدت کے جاڑے پڑ رہے ہوتے اور برف گر رہی ہوتی، لیکن گھر جا کر وضو کر آتے۔ حسام الدین چلپی کی درخواست اور استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔

مولانا رومی 5 جمادی الثانی 272ھ (1272ء) بروز یک شنبہ غروبِ آفتاب کے وقت راہیٔ ملک عدم ہو گئے۔ شیخ صدرالدین نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مگر فرطِ غم سے چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آخر قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جنازے میں بچے، جوان، بوڑھے، امیر، غریب، عالم، جاہل ہر طبقے اور فرقے کے آدمی جنازے کے ساتھ تھے۔ اور چیخیں مار مار کر روتے جاتے تھے۔ عیسائی اور یہودی تک جنازے کے آگے آگے انجیل اور توریت پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ شام ہونے تک جنازہ قبرستان پہنچا۔ چالیس دن تک لوگ مزار کی زیارت کو آتے رہے۔ قونیہ میں مولانا روم کا مزار آج تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

عارفِ رومی اپنے اخلاق و کردار میں اتباعِ رسولؐ اور حسنِ اخلاق کا پیکرِ مجسم تھے۔ آپ کے آئینہ اخلاق میں عبادت و ریاضت، خشیتِ الٰہی، زہد و قناعت، فیاضی و ایثار، استغنا و بے نفسی اور کسب حلال کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

۱) مولانا کی تصانیف میں فیہ مافیہ (یہ مولانا کے نثر کے ملفوظات کا مجموعہ ہے) اس کا مسودہ مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد نے صاف کیا تھا (751ھ)۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۲) مکتوبات و خطابات (نثر) یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کو لکھے تھے۔ مولانا علمی مجالس میں جو مسائل بیان فرماتے انہیں سلطان بہاؤالدین محفوظ کر لیتے۔ ان ملفوظات کا تخاطب پروانہ کے علاوہ سب کی طرف ہے۔ فیہ مافیہ مواعظ اور مکتوبات کا ذخیرہ ہے۔

۳) دیوانِ شمس تبریز (دیوان کبیر) یہ مولانا روم کا مجموعۂ غزلیات ہے۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں۔ اس مجموعے کا نام مولانا نے اس عشق و محبت کی بنا پر جو انہیں حضرت شمس تبریز سے تھی، دیوانِ شمس تبریز رکھا۔ ان غزلوں کا ہر شعر اثر و تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہجر و عشق کی کیفیات کو جہاں انہوں نے شعر میں سمویا ہے اس نے شعر کو ایک نیا کیف اور تاثیر عطا کی ہے۔ ان غزلوں میں بھی تصوّف کے نازک معانی حسن و دلکشی سے بیان کئے گئے ہیں۔

ہزار بار پیادہ طوافِ کعبہ کنی
قبولِ حق نشود گر دِلے بیازاری
زعرش و کرسی و لوح و قلم فزوں باشد
دلِ خراب کہ او را بہ ہیچ نشماری

۴) مثنوی مولانا رومؒ:

''شاعری اور تصوّف کو سب سے پہلے حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ہم آہنگ کر کے تصوّف کے اسرار و نکات پیش کئے۔ اس کے بعد حکم سنائی نے مثنوی کو موضوعِ سخن بنا کر تصوّف کو عوام تک پہنچانے میں زبردست خدمات انجام دی۔ بعد ازاں حضرت شیخ فرید الدین عطار نے اپنی شاعری سے تصوّف کی دولت کو عام کیا۔ مولانا روم کی مثنوی نے لوگوں کے دلوں میں ایمان اور الفان کی ایک نئی حرارت بخشی۔ مولانا نے حکایتوں کے ذریعے اخلاقیات کی تعلیم دی ہے۔ مولانا کی مثنوی چھ دفاتر پر مشتمل ہے۔ بقول صاحب مجمع الفصحا ایران میں جن چار کتابوں کو مقبولیت حاصل ہوئی، (شاہ نامہ فردوسی، گلستان سعدی، مثنوی مولانا روم، دیوانِ حافظ ان سب میں مثنوی مولانا روم کو ترجیح حاصل ہے۔ مثنوی میں ۲۶ ہزار اشعار ہیں۔ مثنوی کے چھ دفتر ہیں۔ مثنوی میں حکایات اور تشبیہ و تماثیل سے کام لیا گیا ہے۔ ''مثنوی مولانا روم دراصل گنجینۂ معارف ہے۔ مولانا نے قصہ و حکایات کے رنگ میں تصوّف کے مضامین عالیہ کو بڑے دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔ اور ان روایتوں اور حکایتوں سے بڑے اہم نتائج نکالے ہیں۔ وہ ان روایات و حکایات میں اپنے استدلال کو قیاس تمثیلی سے مزّین کرتے ہیں۔ اور انہوں نے مثنوی میں بہت زیادہ تشبیہ و تمثیل سے کام لیا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مسائل کو فہم سے قریب تر کر دیا ہے۔'' (12)

مولانا کے کلام (مثنوی) کا اہم ترین موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ انہوں نے فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ سعی و عمل کی تلقین کرتے ہیں مگر رہبانیت یا گوشہ نشینی کی ترغیب نہیں دیتے۔ وہ عقل کی افادیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر عشق کو امام سمجھتے ہیں مولانا روم کے نزدیک انسان عشق و روحانیت کے مسلسل مراحل طے کر کے ایک ایسا ارفع مقام حاصل کر سکتا ہے جہاں پر رب کریم اس کی کسی دعا اور استدعا کو رد نہیں کرتا۔

مولانا روم کی مثنوی معنوی میں قرآن پاک صاف جھلکتا ہے۔ احادیث و اقوال کے گراں قدر موتی چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ دنیاوی عقل کے لیے بھی رہنمائی موجود ہے۔ اور تصوّف کا گراں قدر خزانہ بھی۔ مولانا روم عشقِ حقیقی کو آبِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں جو دل کو زندگی اور روح کو نشاط بخشتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ عِلّت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

مولانا روم: درویش صفت نکتہ دان

مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی ایک اعلیٰ پایہ شاعر اور درویش صفت نکتہ دان ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ فارسی زبان وادب میں ایک نمایاں اور قابل احترام مقام رکھتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ (672، 604ھ) اور ان کی تصانیف کی تعارف کی محتاج نہیں ان کی چھ دفاتر یا جلدوں پر مشتمل مثنوی اور ضخیم دیوان (دیوان کبیر) (دیوان شمس) فکرِ انسانی کے نقطۂ کمال کی حامل کتابیں ہیں۔ مثنوی کا ڈاکٹر اے۔ آر نیکلسن کا (1944ء کا) مرتبہ متن (28 ہزار ابیات کے لگ بھگ) اور دیوان مرتبہ از پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر (1970ء) دیگر طباعتوں سے بہتر مانے جاتے ہیں۔ رومیؒ کی تین نظم ونثر سے ممزوج کتب بھی ہیں۔ فیہ و مافیہہ (ملفوظات رومی کا فارسی متن) مکاتیب (141 فارسی اور 4 عربی خطوط) اور مجالس (سات یا نو خطبات) چوتھی اور پانچویں کتاب 37-1936ء میں ترکی میں شائع ہوئی۔ اور دوسری بار ایران میں (مکاتیب 1956ء میں اور مجالس 1940ء میں)۔ ان دونوں کتابوں کا اُردو ترجمہ راقم نے 1988ء میں اور مکتوبات ومواعظ رومی کے عنوان سے لاہور سے شائع کروایا۔ (اقبال اکادمی پاکستان صفحات 500 قطع طویل)۔ مقدمے میں ضروری توضیحات موجود ہیں۔۔۔

فیہ مافیہہ 1334ھ (1916ء) میں تہران سے لیتھوگراف طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اور 1928ء میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اسے اعظم گڑھ سے شائع کروایا۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۵۶ء میں تہران سے استاد بدیع الزمان فروزانفر کے ذریعے ہوئی۔ ملفوظات رومیؒ اس متن کا ترجمہ ہے۔ استاد فروزانفر نے رومی کے حالات وآثار پر مبنی اپنی کتاب (طبع اول 1937ء اور طبع دوم 1954ء) نیز استاد سعید نفیسی (1966ء) نے اپنی کئی تحریروں میں رومی کے مکتوبات اور ان کی مجالس کا خاطر خواہ ذکر دیا تھا، مگر فیہ مافیہہ کے مترجم کو ان تحریروں کی خبر نہ ہوئی اور وہ۔۔۔ رومی کی ایک ہی نثری کتاب (ملفوظات) کی موجودگی میں مصر رہے۔ یہاں اس امر کا بھی ذکر

کردیں کہ رومی کی نثری کتابوں (مکاتیب، مجالس خطبات اور فیہ مافیہ) میں دیگر مقدم یا معاصر شعراء کے ابیات کے علاوہ رومی کی مثنوی اور دیوان کبیر یا دیوان شمس تبریزی (کل اشعار کوئی 57 ہزار) کے متعدد اشعار منقول ملتے ہیں۔ ملفوظات رومی کو رومی کی دیگر چار کتب کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ پانچوں کتب آخر ایک ہی شخص کی تحریر یا گفتار ہیں۔۔۔''

برصغیر میں مطالعہ رومی کے سلسلے میں مثنوی شریف سے زیادہ اعتنا رہا ہے اور اس کتاب کا حق بھی یہی تھا۔ دیوان کبیر کی ضخامت مثنوی کے اشعار سے دوچند ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ دیوان کی مسلسل غزلوں کی دل آویزی اور معنی خیزی کے باوجود اس میں حکایات نہیں جو انسانی طبائع کو بہت بھاتی ہیں۔ رومی کی دیگر سہ گانہ تصانیف یعنی یہ ملفوظات، مکتوبات اور خطبات بھی حکایات سے مزین ہیں۔ فیہ مافیہ (ملفوظات) کے مطالب میں جیسا کہ ارشاد ہوا، دیگر چہار گانہ کتب رومی کے ساتھ اشتراک معانی کئی مقام پر محسوس ہوتا ہے مثلاً آفتاب کائنات کے پردے میں منبع ءِ حیات اور آفتاب حقیقی کی توصیف۔۔۔ مترجم نے گفتار رومی کی توضیح میں ان کے اور دیگر شعرا جیسے سنائی اور عطار کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ''ملفوظات رومی'' ایک علمی کتاب ہے۔ فکر رومی سے اعتنا کرنے والوں اور علوم اسلامیہ سے وابستہ افراد کیلئے اس کا مطالعہ مفید ہے اور عام تعلیم یافتہ افراد کے لئے اس کے اکثر مطالب لائق توجہ ہوں گے۔

جب عرب نورِ اسلام کی روشنی سے منور ہوا تو اس کی تعلیمات چار دانگ عالم میں پھیل گئیں۔ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ جب تک عوام رنگ و نسل کو مٹا کر خالص اسلامی اصولوں پر کاربند رہے وہ دنیا کی عظیم ترین طاقت تھے۔ لیکن جب دین اور سیاست نے علیحدہ علیحدہ راستے اختیار کئے تو اسلامی حکومت کی وحدت میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ خلفائے راشدین کے بعد اُمیہ اور عباسیہ خلافتیں اس ذہنی اور عملی رویئے کی آئینہ دار ہیں۔ اگرچہ خالص اسلامی تعلیمات کو پھیلانے اور اُمت کے اسلامی استحکام کے لئے علماء اور اہل کمال نے اپنی کوششیں جاری رکھیں، لیکن آخر کار۔۔۔ نااہلی اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے آخری خلیفہ معتصم باللہ کا خاتمہ ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوا۔ یہ 1258/656ء کا پُر آشوب زمانہ ہے۔ خلافت کا خاتمہ بغداد اور عربوں کی تباہی ہی نہ تھی بلکہ پورا عالمِ اسلام زوال پذیر تھا۔ زنگ آلود تلواریں جب کُند ہو گئیں تو تصوّف نے ایک بار ملتِ اسلامیہ کو سہارا دیا۔

تصوّف کے معنی موجود زمانے میں کچھ بھی ہوں، لیکن ابتدا میں یہ دین اور اس کے اصولوں کو اہل طریقت کے رگ و پے میں جاری وساری کرنے کا نام تھا۔ اس لئے تصوّف نے ہر اُس کارروائی کے خلاف آواز بلند کی جو اسلام کے بنیادی اصول اور مقاصد کے خلاف نظر آئی۔ اور عملی طور پر صوفیائے کرام نے خانقاہوں میں انفرادی اور اجتماعی کردار سازی کی تعلیم

کی مہم شروع کی اور بڑی بڑی خانقاہیں انہیں مقاصد کے لئے قائم کیں۔ خلافتِ عباسیہ کے آخری دور میں جو اہل تصوّف اور ان کی خانقاہوں اور روحانی سلسلوں کے نام نظر آتے ہیں، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ دورِ زوال میں اُمت کو سنبھالنے کے لئے فوجی، انتظامی اور سیاسی طریقوں سے ہٹ کر، اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی استحکام پیدا کرنے کے لئے ان صوفیاء نے اپنی سرگرم کوششوں کو جاری رکھا اور ان کے سلسلے اور سلوک قائم کئے۔[12]

> ''تصوّف کے بارے میں ایک چلتا ہوا فقرہ کہا جاتا ہے کہ یہ زوال کی پیداوار ہے۔ یہ خیال لوگوں کو اس لئے پیدا ہوا کہ جب سلطنت عباسیہ پر زوال آیا اور امت مسلمہ طرح طرح کے حوادث کا شکار ہوئی تو اہل تصوّف نے حوادث کا زور توڑنے کیلئے کام شروع کیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ بڑے بڑے صوفیوں میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور احمد الکبیر رفاعیؒ کے خلفاء پورے افریقہ اور ایشیاء میں جا بجا باقاعدگی سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ اور اُن کے مرید مشرف الدین بن مصلح الدین سعدیؒ ایک طرف، تو دوسری طرف مولانا جلال الدین رومیؒ، بوعلی قلندرؒ، خواجہ فریدالدین عطارؒ، نجم الدین رازیؒ وغیرہ تعلیم اور کردار سازی کے سلسلے کی وہ کڑیاں ہیں، جو فارسی نظم ونثر کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کے دلوں کی تطہیر کرتی نظر آتی ہیں۔''(13)

ان بزرگوں سے پیشتر صوفیوں کا ایک حلقہ یاس انگیز ماحول میں ترکِ دنیا کی طرف شدت سے مائل ہو گیا تھا اور دوسرا حلقہ جو حکومتِ وقت سے وابستہ تھا، وہ دنیا کی محبت میں غرق ہو گیا۔ گویا ایک حلقہ خود کو مجبورِ محض تصور کرنے لگا اور دوسرا مختارِ کُل۔ مولانا رومیؒ اور ان کے معاصرین نے درمیانی اور اعتدال کی راہ کو نمایاں کیا، امید کی پرورش کی، کردار سازی کی طرف توجہ دلائی۔ سرگرمیٔ عمل کی تعلیم دی اور طریقت وشریعت کے اختلاف کو ختم کر کے مسلمانوں کے قلب میں احکامِ شرعی کی حقانیت اور صداقت کا احساس پیدا کیا جو عشقِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ صوفیوں کو کشف اور وجدان کے ذریعے شریعت اور حقانیت سے باخبر کیا، تاکہ وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں احکامِ شرعی کی حقیقت راز سے واقف ہو جائیں۔ یہی تعلیم مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کی بنیاد ہے۔

آپ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں غزلیات کا دیوان بھی ہے۔ لیکن جس قدر مثنوی معنوی کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ فارسی کی کسی بھی کتاب کو نصیب نہ ہو سکی۔ صاحب ''مجمع الفصحاء'' نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں مثنوی مولانائے روم، شاہ نامہ فردوسی، گلستان، دیوان حافظ شیرازی سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان

چار کتابوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی مولانائے روم کو ترجیح دینی ہوگی کیونکہ علما اور فضلا نے تعلیم اور تربیت یعنی کردار سازی کے لیے مثنوی سے بہتر کسی کو نہ پایا۔ اس مثنوی کے چھ دفتر ہیں۔ چونکہ مولانا کا فن شاعری نہ تھا، بلکہ کردار سازی تھا، لہذا عام طور پر یہ رائے قائم ہوگئی۔

مثنویٔ مولویٔ معنوی

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

یعنی یہ مثنوی کلام پاک کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ ان کے کلام میں وہ روانی برجستگی، نشست الفاظ اور حسنِ ترکیب تو نہیں پائی جاتی جو اساتذہ اور شعراء کا خاص انداز ہے۔ اس لیے بعض لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کئے ہیں لیکن مولانا نے ان کے جواب میں یہ کہا ہے:

من ندانم فاعلاتن فاعلات

شعر می گویم بہ از قند و نبات

تاہم ہزاروں اشعار ایسے ہیں، جن کی صفائی، برجستگی اور دلآویزی کا جواب نہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما

اے تو افلاطون و جالینوس ما

.....

وحی آمد سُوئے موسٰی از خدا

بندۂ مارا چرا کردی جُدا

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

.....

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم

ملتِ عشق از ہمہ دیں ہا جداست

عاشقاں را مذہب و مِلّت جداست

پائے استقلال خود چوبین بود

پائے چوبین سخت بے تمکین بود

.....

گر بہ استقلال کار دین بُدے

فخرِ رازی راز دار دین بُدے (مثنوی مولانا روم)

مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت طرزِ استدلال اور طریقہ افہام ہے۔۔۔مولانا نے مثنوی میں زیادہ قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے کیونکہ درحقیقت عوام کی افہام وتفہیم کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا تھا۔مولانا اپنے زمانے کے بہترین متکلمین میں سے تھے۔اگرچہ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے علم کلام کو بہت بلندی تک پہنچا دیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسائل کو جس خوبی سے مثنوی میں آپ نے ثابت کیا ہے،اس کے سامنے تمام دفتر ہیچ ہیں۔ڈاکٹر بیگم صفیہ تمنائی لکھتی ہیں:

''برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں مثنوی کا بڑا ہاتھ ہے۔گویا دوسرے معنوں میں اسلامی تعلیم کی پوری تاریخ پر مثنوی معنوی حاوی نظر آتی ہے۔''(14)

ڈاکٹر فرقان حمید کے خیال میں:

''مولانا روم کو دوسرے مفکّرین سے منفرد بنانے والی ایک اور خصوصیت سوچ اور فن کا امتزاج ہے۔اپنے اشعار کو روپ دینے والے مولانا رومؒ شاعر کے طور پر بھی بڑا بلند اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔۔۔مولانا نے شعر کو خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔درحقیقت وہ بیان میں وزن اور قافیے کی رکاوٹ کے مخالف ہیں۔ان کے اشعار کا دیوان اکیس بڑی جلدوں پر مشتمل ہے۔جس میں انہوں نے اپنے خیالات کو حکایات اور مثالوں سمجھایا ہے۔''(15)

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل مشکل،پیچیدہ اور فلسفیانہ باتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک انداز ہے جسے اہل فُن ،صوفیا اور شعرا آسانی پیدا کرنے کے لیے اختیار کر لیتے ہیں اور یہ انداز مولانا جلال الدین رومی کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔۔۔اور خود فرماتے ہیں:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

چنانچہ وہ روح کو ''نی'' اوراس کی آہ وزاری کو ''نالۂ نی'' سے تشبیہہ دے کراپنی مثنوی کا آغاز کرتے ہیں:

بشنو از نی چون حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

مولانا رومؒ کے ذہن میں جب ایک مضمون آتا ہے تو وہ اس سے کئی مضامین پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات مولانا روم ایک تمثیل کی وضاحت بھی ایک اور تمثیل ہی کے ذریعے کرتے ہیں۔۔۔ بعض اوقات مولانا رومؒ کسی خاص نکتے کو واضح کرنے کے لیے کوئی تمثیلی واقعہ پیش کرتے ہیں۔۔۔ مولانا جلال الدین کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اکثر تلمیحات سے بھی تمثیل کا کام لیتے ہیں جس سے پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور بیان مدلل اور مضبوط ہو جاتا ہے۔۔۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا روم ایک مصرعہ میں کسی مضمون کو تمثیلی رنگ میں بیان کرتے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں اس کی دلیل بھی دیتے ہیں جس سے مطلب اور بھی روشن تر ہو جاتا ہے۔

در شب بدرنگ بس نیکی بود
آبِ حیواں جفتِ تاریکی بود

مثنوی سے پہلے جو کتابیں اخلاق وتصوّف میں لکھی گئیں، ان کا یہ انداز تھا کہ اخلاق وتصوّف میں لکھی گئیں تصوّف کے مختلف عنوان قائم کر کے اخلاقی حکایتیں لکھتے ہیں اوران سے نتائج پیدا کرتے تھے۔ منطق الطّیر اور بوستان کا یہی انداز ہے۔ حدیقہ میں اکثر مسائل کو مستقل طور پر بھی بیان کیا ہے مثلاً نفس، عقل، عمل، تنزلیہہ، صفات معرفت، وجد، توکل، صبر، شکر وغیرہ کے عنوان قائم کئے ہیں اوران کی حقیقت بیان کی ہے لیکن مثنوی کا یہ انداز نہیں۔ مثنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں۔ دفتروں کی جو تقسیم کی، وہ خصوصیتِ مضمون کے لحاظ سے ہیں بلکہ جس طرح قرآن مجید کے پارے یا ایک شاعر کے متعدد دیوان ہوتے ہیں۔

یہ امر یقینی ہے ہے کہ مولانا نے حدیقہ اور منطق الطیر کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی، خود فرماتے ہیں:

ترکِ جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیم غزنوی بشنو تمام

در الٰہی نامہ گوید شرح ایں
آں حکیم غیب و فخرالعارفین

بعض بعض موقعوں پر باوجود بحر کے مختلف ہونے کے مثنوی میں حدیقہ کے اشعار نقل کئے ہیں اور ان کی شرح لکھی ہے۔ بعض جگہ حدیقہ کے اشعار سے مضمون میں بالکل توارد ہو گیا ہے مثلاً حدیقہ میں جہاں نفس کی حقیقت لکھی ہے۔ اس موقع کا شعر ہے:

روح با عقل و علم داند زیست
روح را پارسی و تازی نیست

مولانا فرماتے ہیں:

روح با عقل ست و باعلم ست یار
روح را با ترکی و تازی چہ کار

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا حدیقہ کو استفادۃً پیش نظر رکھتے تھے اور اس وجہ سے حدیقہ کے الفاظ اور ترکیبیں بھی ان کی زبان پر چڑھ گئی تھیں۔ مولانا شبلی کے مطابق:

''لیکن یہ سب کچھ مولانا کا تواضع اور نیک نفسی ہے ورنہ مثنوی کو حدیقہ اور منطق الطیر سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو گوہر سے ہے۔ سینکڑوں حقائق و اسرار جو مثنوی میں بیان ہوئے ہیں حدیقہ وغیرہ میں سرے سے ان کا پتہ ہی نہیں۔'' (16)

اخلاق و سلوک کے بعض مسائل ایسے ہیں، جن میں اہل نظر مختلف الرائے ہیں۔ ان مسائل کو مولانا نے فرضی مناظروں کے ذیل میں ادا کیا ہے۔۔۔ جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔۔۔ ''عموماً یہ مسلم ہے کہ مثنوی کا اصلی موضوع شریعت کے اسرار اور طریقت و حقیقت کے مسائل کا بیان کرنا ہے۔ اس لیے ان الفاظ کے معنی سمجھنے چاہییں۔ ان تینوں چیزوں کی حقیقت خود مولانا نے دفتر پنجم کے دیباچہ میں یہ لکھی ہے:

''شریعت ہمچوں شمع است کہ راہ می نماید، چوں در راہ آمدی ایں رفتن تو طریقت است و چوں بہ مقصود رسیدی آں حقیقت است۔ حاصل آنکہ شریعت ہمچوں علم کیمیا آموختن است از اُستاد یا از کتاب، و طریقت استعمال کردن دارو ہا و مس را در کیمیا مالیدن و حقیقت زر شدن مس۔ یا مثالِ شریعت ہمچوں علم طب آموختن است و طریقت پرہیز کردن بموجب علم طب و دارو خوردن و حقیقت صحت یافتن۔''

محترم ڈاکٹر محمد ریاض یوں رقمطراز ہیں:

''شاعر کے بعد رومی ایک عظیم متکلم کے طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان کے اس پہلو کو کسی قدر علامہ شبلی نعمانی (م1914ء) نے سوانح مولانا روم میں بیان کیا۔ بعد میں علامہ اقبال (م1938ء) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (م1959ء) اور میر ولی الدین وغیرہ نے اپنی تصانیف کے ذریعے متکلم رومی کے افکار کو نمایاں تر کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس ضمن میں مولانا اشرف علی تھانوی (م1943ء) کی شرح مثنوی بھی کم اہم نہیں۔ ایران میں اُستاد بدیع الزمان فیروز انفر، اُستاد جلال الدین ھمائی اور کئی دیگر اصحاب نے اس ضمن میں کافی کام کیا ہے۔ مگر رومی کے سے حکمتِ قرآنیہ سے آگاہ شخص کے بارے میں تحقیقات کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔''(17)

شبلی علم الکلام میں بجا طور پر رومیؒ کو بہت بڑا مزاج شناس اسلام قرار دیتے ہیں۔ مگر یہاں مجھے رومیؒ کی ایک تیسری حیثیت کے بارے میں مختصر گفتگو کرنا مقصود ہے۔ یہ حیثیت صوفی رومیؒ سے مربوط ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فقر و تصوّف کے بارے میں رومی کا رویہ کیا تھا۔؟ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اقبال نے رومیؒ کی اس حیثیت پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک مثنوی رومی، ایک مرشد و راہنما ہے۔ جو رقصِ روح کا گُر سکھاتی ہے۔

مولانا رومیؒ نے اس فقرِ غیور کا درس دیا ہے جس میں مسکنت اور سر بزیری کا کوئی شائبہ نہیں ہے:

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومیؒ مغز را داند ز پوست
پائے او محکم فتد در کوی دوست
شرح او کردند ادرا کس ندید
معنی او چوں غزال از ما رمید

.....

بکام خود دگر آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملک پرویز

.....

ز اشعار جلال الدین رومیؒ
بہ دیوار حریم دل بیاویز
بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے
کہ تاثیرش دھد لعلے بہ سنگے
غزالے را دل شیرے بہ بخشد
بشوید داغ از پشت پلنگے
ز رومی گیر اسرار فقیری
کہ آں فقر است محسود امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ ازوے
رسیدی بر مقام سربزیری (18)

علامہ اقبالؒ کی شخصیت پر مولانا رومیؒ کا پرتو

علامہ اقبالؒ کی زندگی اوران کی جملہ تصانیف سے مولانا روم کی عقیدت اور محبت کی بھرپور جھلک واضح نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا ہے۔ کہ ان کی فکر کے پس پردہ مولانا روم کے خیالات عالیہ کارفرما ہیں اورانہوں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ قرآن حکیم اور مثنوی مولانا روم کا فیضان ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآن پاک کی طرف ان کے رجوع کا سبب بننے کا شرف بھی مثنوی معنوی کو حاصل ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ علامہ اقبال مولانا رومؒ کے روحانی تلمیذ ہیں۔ اقبال کی تمام شاعری اور شاعرانہ افکار ہیں قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم کا روحانی فیضان جلوہ گر نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف ''اسرارِ خودی'' 12 ستمبر 1915ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کا آغاز بھی علامہ اقبال نے مولانا جلال الدین رومی کے ان اشعار سے کیا ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہان سست عناصرِ دلم گرفت
شیرِ خدا و رُستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست (مثنوی مولانا روم)

علامہ اقبالؒ مولانا رومؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے کبھی تھکے ماندے نظر نہیں آتے اور وہ واشگاف الفاظ میں ان کی صحبت اور فیوض و برکات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے مطابق ''فکر اقبال کے مآخذ میں رومی کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ میرے میکدے کی شراب پیرِ روم کے خُمستان سے حاصل کردہ ہے۔

مولانا کے نزدیک ''اَلْفَقْرُ فَخْرِی'' زندگی کا منشور بنانے کے لائق ہے۔ اور فقر نارسائی اور درماندگی کا نہیں بلکہ عزت وشان کا مظہر ہے۔

مولانا کے احباب میں صلاح الدین زرکوب اور شیخ حسام الدین چلپی کے نام اہم ہیں لیکن جس شخصیت نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا وہ ان کے مرشدِ روحانی حضرت شیخ شمس تبریز کی ہے جو بابا کمال الدین کے خلیفہ تھے۔ اور جنہوں نے قونیہ جا کر ان سے ملاقات کی تھی۔ جس سے مولانا کی قلب ماہیت ہوگئی۔ مولانا کا تعلق خاطر (حضرت شمس تبریز سے) عشق کے درجے کو پہنچ گیا تھا حتٰی کہ مولانا نے اپنے دیوانِ غالیات کو اپنے نام کی بجائے اپنے شیخ کے نام سے منسوب کر کے ''دیوانِ شمس تبریز'' قرار دیا ہے۔

صلاح الدین زرکوب جلد انتقال کر گئے۔ اس کے بعد مولانا کا رشتہ محبت حسام الدین چلپی سے استوار ہوا۔ چلپی کے ایماء پر مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی، مثنوی معنوی تخلیق کی۔

مدتی ایں مثنوی تاخیر شد
مہلتی بایست تاخون شیر شد

اقبالؒ زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مُرشد رومی کے سر باندھتے ہیں۔

اسرار و رموز کے دیباچے میں علامہ نے مولانا رومیؒ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم
دفتر سر بستہ اسرارِ علوم

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
شمع سوزاں تاخت بر پروانہ ام
بادہ شنجوں ریخت بر پیمانہ ام
پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
ذرہ از خاکِ بیاباں رخت بست
تاشعاعِ آفتاب آرد بدست
موجم و در بحر او منزل کنم
تا دُرّ تابندۂ حاصل کنم
من کہ مستی ہاز صہبائش کنم
زندگانی از نفس ہائیش کنم

(کلیات اقبال، فارسی)

اسی طرح آگے چل کر کہتے ہیں:

شب دلِ من مائل فریاد بود
خامشی از یاربم آباد بود
شکوہ آشوبِ غمِ دوراں بُدم
از تہی پیمانگی نالاں بُدم

.....

ایں قدر نظّارہ ام بے تاب شُد
بال و پر بشکست و آخر خواب شُد
روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

گُفت :اے دیوانۂ اربابِ عشق
جُرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق
بر جگر ہنگامہ محشر بزن
شیشہ برسر، دیدہ برنشتر بزن
خندہ را سرمایۂ صد نالہ ساز
اشکِ خونین را جگر پر کالہ ساز
تا کجے چوں غنچہ می باشی خموش
نکہت خود راچو گل ارزاں فروش
چوں جرس آخر ز ہر جُزوبدن
نالۂ خاموش را بیروں فگن
آتش استی بزم عالم برفروز
دیگراں راہم زسوز خود بسوز
فاش گو اسرار پیر مے فروش
موج مے شو کسوتِ مینا بپوش
سنگ شو آئینہ اندیشہ را
برسر بازار بشکن شیشہ را
از نیستان ہمچونے پیغام دہ
قیس را از قوم خے پیغام دہ
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را
از قُم خود زندہ ترکُن زندہ را
خیزو پا بر جادۂ دگر بنہ
جوشِ سودائے کُہن از سر بنہ

آشنائے لذتِ گفتار شو
اے درائے کارواں بیدار شو
زیں سُخن آتش بہ پیراہن شُدم
مثلِ نے ہنگامہ آبستن شُدم
چوں نوا از تارِ خود برخاستم
جنتے از بہر گوش آراستم
برگرفتم پردہ از رازِ خودی
وا نمودم سِرِّ اعجاز خودی (کلیاتِ اقبال، فارسی)

بعدازاں ''در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد'' میں یوں اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔

کیمیا پیدا کُن از مشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمس خود را ہمچو رومی بر فروز
روم رادر آتش تبریز سوز (کلیاتِ اقبال، فارسی)

علم ماہیت کو یوں بیان کیا ہے:

اے کہ باشی درپئے کسبِ علوم
باتو می گویم پیامِ پیرِ روم
''علم را برتن زنی ، مارے بود
علم را بر دل زنی ، یارے بود
پیر تبریزی ز ارشادِ کمال
جُست راہِ مکتب مُلّا جلال
گفت ایں غوغا و قیل و قال چست
ایں قیاس و وہم و استدلال چسیت

سوزِ شمس از گفتۂ مُلّا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود
علمِ مُسلم کامل از سوزِ دل است
معنیٔ اسلام ترک آفل است
حرفِ اقراء حق بما تعلیم کرد
رزقِ خویش از دستِ ما تقسیم کرد

''اقبال شیفتگی خاصی بہ مولانا جلال الدین محمد بلخی (مولوی) شاعر و عارف نامی در قرن ہفتم ایران دارد۔ بہ طوری کہ تاثیر بسیار زیاد و چشم گیر مولوی در کلیۂ آثار و اشعار او بہ چشم می خورد۔ وی در اشعار خود مولوی را آخوند روم، پیر روم، پیرِ حق سرشت، پیر یزدانی، پیر عجم، مولانا روم، مرشد روم، مُلا جلال نامیدہ است۔ در ''اسرار خودی'' آوردہ است۔''(19)

آگہی از قصۂ آخوند روم
آنکہ داد اندر حلب درس علوم
پائے در زنجیر توجیہات عقل
کشتی اش طوفانی ''ظلماتِ'' عقل
موسیٰ بیگانۂ سینائے عشق
بے خبر از عشق و از سودائے عشق
از تشکک گفت و از اشراق گفت
وزِ حکم صد گوہرِ تابندہ سُفت
عقدہ ہائے قولِ مشائیں کشود
نورِ فکرش ہر خفی را وانمود
گرد و پیشش بود انبار کُتب
برلبِ او شرحِ اسرارِ کتب
پیر تبریزی ز ارشادِ کمال

جُست راہِ مکتب مُلّا جلال
گُفت ایں غوغا و قیل و قالِ چیست
ایں قیاس و وہم و استدلال چیست
مولوی فرمود ناداں لب بہ بند
بر مقالاتِ خردمنداں مخند
پائے خویش از مکتبم بیروں گزار
قیل و قال است ایں ترا با وے چہ کار
قالِ ما از فہمِ تو بالا تراست
شیشۂ ادراک راروشن گر است
سوزِ شمس از گفتۂ مُلّا فزود
آتشے از جانِ تبریزی کشود
برزمیں برقِ نگاہ اوفتاد
خاک از سوزِ دم او شعلہ زاد
آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت
دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت
مولوی بیگانہ از اعجاز عشق
ناشناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق
گُفت :ایں آتش چساں افرفتی؟
دفترِ اربابِ حکمت سوختی
گفت شیخ : اے مسلم زنّار دار
ذوق و حال است ایں ، ترا با وے چہ کار
حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است

ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ
از سحابِ فکر تو بارد تگرگ
آتشے افروز از خاشاک خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

(کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرارخودی)

اسرارخودی کا دوسرا حصہ رموزی بے خودی 10 اپریل 1918ء کو طبع ہو کر سامنے آیا۔ بعد میں اسے اسرارورموز کا نام سے یکجا کر دیا گیا۔اس کا آغاز مولانا روم کے اس شعر سے کرتے ہیں۔

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصّواب (مولانا روم)

.....

لذت، ایمان فزاید درعمل
مردہ آن ایماں کہ ناید درعمل

.....

از پیامِ مصطفٰے آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات اور دوسری تحریروں میں بھی رومی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔انہوں اپنے نے کلام میں ہر جگہ اپنے روحانی مرشد محمد جلال الدین رومیؒ کے حوالے دیتے ہیں جن سے القاء پر روشنی پڑتی ہے جو انہیں حضرت مولانا رومؒ کے کلام سے نصیب ہوا۔''پیامِ مشرق'' علامہ اقبال کی تیسری فارسی تصنیف ہے۔ (5،9 مئی 1923ء) کو منصۂ شہود پر آئی۔

علامہ اقبالؒ نے ''پیامِ مشرق'' کا آغاز غازی امان اللہ خان کے نام جو انتساب کیا ہے اس میں اپنے مرشد روحانی کی شان میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

مُرشدِ رومی حکیم پاک باز
سِرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد

اس کے بعد حکمت وشعر کے ضمن میں یوں بیان کرتے ہیں:

بوعلی اندر غبار ناقہ گُم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فرو تر رفت و تاگو ہر رسید
آں بگردابے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

.....

عقلے کہ جہاں سوزد ، یک جلوۂ بیباکش
از عشق بیاموزد ، آئینِ جہانتابی
عشق است کہ درجانت ہر کیفیت انگیزد
از تب و تاب رومی تا حیرتِ فارابی

.....

ایں حرفِ نشاط آور ، می گویم و می رقصم
ازعشق دل آساید ، با ایں ہمہ بیتابی
ہر معنئ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بہ دل در شو ، شاید کہ تو دریابی
مطرب غزلے، بیتے از مُرشدِ روم آور
تاغوطہ زند جانم در آتش تبریزے

.....

بیاکہ من زخُم پیر روم آور دم
مئے سُخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی است

.....

اگرچہ زادۂ ہندم ، فروغِ چشم من است
زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

.....

شعلۂ درگیر زد برخس و خاشاک من
مُرشدِ رومی کہ گفت ''منزلِ ما کبریا است''

''جلال وہیگل'' میں یوں موازنہ بیان کرتے ہیں:

خواب برمن و دمید افسونے — چشم بستم ز باقی و فانی
نگہ شوق تیز تر گردید — چہرہ بنمود پیرِ یزدانی
آفتابے کہ از تجلّی او — اُفقِ روم و شام نورانی
شعلہ اش درجہانِ تیرہ نہاد — بہ بیاباں چراغِ رہبانی
معنی از حرفِ او ہمی روید — صفت لالہ ہائے نعمانی
گفت بامن ، چہ خفتۂ برخیز — بہ سرابے سفینہ می رانی

''بہ خرد راہ عشق می پوئی؟
بہ چراغ آفتاب می جوئی؟''

''جلال وگوئٹے'' کے درمیان مکالمہ یوں بیان کرتے ہیں

نکتہ دانِ المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب !
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قِصۂ پیمانِ ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن راجاں نگار
تو ملک صید استی ویزداں شکار
فکرِ تو در کج دل خلوت گزید
ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید

سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کے شایانِ ایں درگاہ نیست

.....

''داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیر کی ز ابلیس و عشق از آدم است''

(رومیؔ)

''شعرا'' کے ذیل میں رومی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

آمیزشے کجا گہر پاکِ اُو کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغرافگنم

(کلیاتِ اقبال، فارسی، پیامِ مشرق)

بانگ درا (1924ء) علامہ اقبال کی اُردو شاعری کی پہلی کتاب ہے۔ ''بلال'' میں یوں بیان کیا ہے:

اقبال ! کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

زبورِعجم (جون 1927ء) میں پیرِ روم کو ان الفاظ سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

رازِ معنی مرشدِ رومی کشود
فکر من بر آستانش درسجود
''معنی آں باشد کہ بستا ندترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا''

جاوید نامہ علامہ اقبال کی معرکۃ آرا شہکار تصنیف ہے جو (1932ء) میں منصۂ شہود پر آئی۔ یہ تصنیف دانتے (Dante) کی آسمانی طربیہ (Divine Comedy) کے مقابلے میں ایک لازوال تصنیف ہے۔ علامہ اقبال اپنے پیرومرشد کے ان روحانی انکشافات کی طرف برملا اشارہ کر کے تفصیل بتاتے ہیں:

پیرِ رومی آں امام راستاں
آشنائے ہر مقامِ راستاں
حرفِ رومی در دلم سوزے فگند
آہ پنجاب !آں زمین ارجمند !

خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو) میں پیر رومی کی تقلید وعقیدت مندی کی یوں تلقین فرماتے ہیں:

پیر رومی را رفیقِ راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
پائے او محکم فتد درکوئے دوست
شرح او کردند او راکس ندید
معنیٔ او چوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند
چشم را از رقص جاں بر دو ختند
رقصِ تن درگردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را !
علم و حِکم از رقصِ جاں آید بدست
ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فرد ازوے صاحبِ جذبِ کلیم !
مِلّت ازوے وارثِ ملکِ عظیم !
گفت رومیؔ از گمانہا پاک شو
خوگرِ رسم و رہِ افلاک شو
ماہ ازما دور و باما آشناست
ایں نخستیں منزل اندر راہِ ماست

.....

گفت رومیؔ خیزد گامے پیش نہ
دولتِ بیدار را از کیف مدہ
باطنش از ظاہرِ او خوشتر است
در قفارِ او جہانے دیگر است
چشم اگر بیناست ہر شے دیدنی است
در ترازوے نگہ سنجیدنی است

.....

رومیؔ آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلاش سبیل

.....

پیر رومی ہر زماں اندر حضور
طلعتش برتافت از ذوق و سرور

.....

پیر رومی آں سراپا جذب و درد
ایں سخن دانم کہ باجانش چہ کرد
رومی از احوالِ جانِ من خبیر
گفت : می خواہی دگر عالم ؟ بگیر !

.....

پیر رومؔ آں صاحبِ ذکر جمیل
ضرب اور اسطوتِ ضرب خلیل
ایں غزل در عالمِ مستی سرود
ہر خدائے کہنہ آمد در سجود

پیر روم اپنے عقیدت مند سے فرماتے ہیں کہ اپنے مقام اور منزل پر پہنچنے کا نام زندگی ہے۔ اور اصل خودی یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو بے حجاب دیکھے۔ ایک مرد مومن صفات سے مطمئن نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ کا ایک صفاتی نام مصطفےٰ ہے علم ذات کے حصول کے سوا راضی نہ ہوئے۔ بقول مولانا رومؒ:

"آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو در نظر رو در نظر"

(مثنوی مولانا روم)

پیر رومی نے ہفت افلاک کی سیر میں جو علامہ اقبال کی رہنمائی فرمائی ہے وہ اُن کے علو افکار کا واضح ثبوت ہے۔ اور اس سے رومیؔ کی روحانی بصیرت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

مردے اندر جستجو آوارۂ
ثابتے با فطرتِ سیارۂ !
چوں عقاب افتد بصیدِ ماہ و مہر
گرم رو اندر طوافِ نہ و سپہر
حرف با اہل زمیں رندانہ گُفت
حور و جنت را بُت و بُتخانہ گفت
شعلہ ہا در موجِ دودش دیدہ ام
کبریا اندر سجودش دیدہ ام
مردِ فقیر آتش است، میری و قیصری خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است
ضربِ قلندر بیاد ، سدِّ سکندری شکن
رسمِ کلیم تازہ کُن، رونقِ ساحری شکن
روحِ رومیؔ پردہ ہا را بر درید
از پسِ کوہ پارہ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب
شیب او فرخندہ چوں عہد شباب

پیکرِ روشن ز نورِ سرمدی
درسرا پائیش سرور سرمدی !
بر لبِ او سرے پنہانِ وجود
بند ہائے حرف و صوت از خود کشود
حرفِ او آئینہ آویختہ
عِلم با سوزِ دروں آمیختہ !

پیر روم اپنے مرید ہندی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ اور پیر رومی اپنے روحانی مرید پر حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں بہت سے اسرار و رموز منکشف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نساذر باصفات
مصطفٰے راضی نشد اِلّا بذات

اقبال نے بھی اسی انداز میں ''جاوید نامہ'' لکھا۔ جس میں وہ مولانا روم کی رہنمائی میں مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں اور اہم شخصیتوں سے ملاقات کرتے ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔

بالِ جبریل (جنوری 1935ء) علامہ اقبال کی دوسری تصنیف ہے جو اُردو میں شائع ہوئی۔ پیر روم کی عقیدت مندی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کبھی نہیں تھکتے!

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سر بکف

.....

نے مہرہ باقی ، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ، ہارا ہے رازی

اقبال نے اپنی مشہور نظم پیر و مرید (پیر رومی و مرید ہندی) میں دورِ حاضر کے معاصری علوم کے بہت سے مسائل منجملہ روح وغیرہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس میں مکالماتی طرزِ تخاطب اختیار کیا گیا ہے۔ اس نظم میں مرید

ہندی سے مراد اقبال خود ہیں۔ یہ مکالمات کافی دلچسپ ہیں۔ اس کے دوران اقبال کے ذہن سے حجابات اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ مرید ہندی پیر رومی سے یوں کہتا ہے:

چشمِ بینا سے ہے جاری جُوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں !

.....

پڑھ لیے ہیں میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درود کرب

پیر رومی کا جواب یہ ہے:

علم را برتن زنی مارے بود
علم رابر جاں زنی یارے بود

پیر روم یوں تلقین فرماتے ہیں کہ انسانیت کے دکھوں کا علاج صرف اور صرف اسلام، قرآن اور تعلیماتِ صاحب قرآن (رسول کریمؐ) ہیں۔

صحبتِ نااہل بیمارت کند
سوئے ما در آ کہ تیمارت کند

ضرب کلیم (جولائی 1936ء) اقبال کی تیسری اُردو تصنیف ہے:

گسستہ تار ہے تیری خودی کا سازاب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (اکتوبر 1936ء) کی اشاعت ہے۔ یہ مثنوی کی صورت میں ہے اس مثنوی میں علامہ اقبال اپنے مُرشدِ روحانی کو عقیدت مندی سے یاد کرتے ہیں اور یوں گویا ہوتے ہیں:

پیرِ رومی مرشد روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب
خیمہ را از کہکشاں ساز و طناب

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

.....

نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم
خویش را در حرفِ او وا سوختم

.....

وقت است کہ بکشائم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسامست

.....

شعرِ رومی خواند و خندید و گریست
یا رب ایں دیوانۂ فرزانہ کیست!

ارمغان حجاز (فارسی، اُردو کلام اقبال) نومبر 1938ء: علامہ اقبال کے وصال کے بعد طبع ہو کر مارکیٹ میں آئی۔ پیر رومی کو خراج عقیدت ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

عطا کن شورِ رومی ، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی
چناں با بندگی در ساختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی
چوں رومی درحرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن اُو
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

.....

ز اشعارِ جلال الدین رومی
بہ دیوارِ حریمِ دل بیآویز

.....

ز رومی گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسود امیری
حزر زاں فقر و درویشی کہ ازوے
رسیدی بر مقامِ سربزیری

.....

ز چشمِ مستِ رومیؔ وام کردم
سرورے از مقامِ کبریائی

.....

مئے روشن ز تاکِ من فروریخت
خوشا مردے کہ دد دامانم آویخت
نصیب از آتشے دارم کہ اوّل
سناؔئی از دلِ رومیؔ بر انگیخت

فکر اقبال کے ماخذ میں رومی (مولانا جلال الدین رومی) کوسنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال داشگاف الفاظ میں رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا مانتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف سمجھنا چاہیے بلکہ اس کو مقبول عام بنانا چاہیے۔

اقبالؒ کے کلام میں بزرگان سلف کے اقوال کا استفادہ رومیؔ کی وساطت سے ہوا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن وحدیث کے معانی عالیہ بھی اقبال نے بنیادی طور پر رومی ہی کے توسط سے لئے ہیں۔ مولانا روم اپنے افکار میں انسانِ کامل کے متلاشی ہیں اور مولانا کے افکار کا واضح پرتو اقبال کے افکار اور اُن کے کلام میں صاف نظر آتا ہے۔

مولانا رومؒ کی روحانی عظمت اور اُن کے افکار سے استفادے کا اظہار اقبال کے فارسی کلام میں بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ اور اُردو کلام میں بھی اعترافِ عظمت کا کُھل کر سامنے آتا ہے۔ مولانا روم اور علامہ اقبال کے موضوعات میں غایت درجہ کا فکری اشتراک پایا جاتا ہے۔ جن میں خاص موضوعات (عشق، انسانِ کامل، خودی، فقر، تقدیر، مذہب، اخلاق، فرد وملت کا باہمی ربط، معاشرت، تعلیم، حسنِ سلوک) وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا رومؒ کے افکار و تصورات کا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی ہر مسئلے میں قرآن حکیم سے رہنمائی کے خواہاں ہیں۔ لہٰذا اقبالؒ اپنے آپ کو زمانہ حاضر عصر نو میں مولانا رومؒ کی فکری توسیع قرار دیتے ہیں۔

جب بھی علامہ اقبالؒ کے کلام اور فکر وفن کا تذکرہ ہوگا تو لازماً حضرت مولانا رومؒ کا بھی ذکر ساتھ ساتھ آئے گا۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ یا پیر رومؒ یا پیر رومیؒ کو اپنا روحانی مرشد تسلیم کیا ہے۔ اور ان کے فکر وفن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی ''اسرار خودی'' میں فرماتے ہیں:

باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سربستہ اسرارِ علوم
پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحر او منزل کم
تا دُرِّ تابندۂ حاصل کنم
من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم
زندگانی از نفس ہائش کنم

(کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرار ورموز)

اقبالؒ، رومیؒ کی شخصیت سے اس وقت سے متاثر ہیں جب انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ (The Development of Metaphysics in Persia) لکھا۔ اس مقالے میں رومیؒ کا ذکر دو جگہ آتا ہے۔ پہلا حوالہ صوفی کی انسانی دوستی کی تائید میں آتا ہے۔ دوسرا حوالہ وہاں آتا ہے جہاں آفرینش کائنات سے بحث کی گئی ہے۔ خطبات اقبالؒ (تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ) میں پہلے، تیسرے، چوتھے اور ساتویں خطبے میں رومیؒ کے افکار سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔

چوتھے خطبے میں تو اقبالؒ نے کہا ہے: ''آج دنیا کو کسی رومیؒ کی ضرورت ہے جو امید کی شمع جلائے اور زندگی کے لیے آتش شوق فرزاں کرے۔'' اسی بات کو ''بالِ جبریل'' میں اس طرح دہرایا ہے:

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایراں ، وہی تبریز ہے ساقی

(کلیاتِ اقبال، اردو، بال جبریل)

پروفیسر سید خورشید حسین بخاری اپنے مضمون ''اقبال اور رومی'' میں لکھتے ہیں:

''اقبالؒ کے فارسی کلام کی نسبت اردو اشعار میں رومیؒ کا تذکرہ زیادہ نہیں ملتا۔ لیکن بالِ جبریل نظم ''پیر و مرید'' ہماری توجہ کھینچتی ہے۔ اس نظم میں مرید ہندی یعنی شاعر اقبالؒ، پیر رومیؒ یعنی رومیؒ سے زندگی کے افکار و حوارث کے بارے میں متعدد سوال کرتا ہے۔ اور پیر رومیؒ کے جواب سے راہ زندگی متعین کرتا ہے۔''(20)

پیر رومیؒ اور مرید ہندی کے درمیاں مکالمہ کچھ یوں ہوا۔

مرید ہندی: چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی: علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی: پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومیؒ: دستِ ہر نااہل بیمارت کند
سوئے ما در آ کہ تیمارت کند

مرید ہندی: ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب
حور جنت سے ہے خوشتر حُورِ عرب

پیر رومی: ظاہر نقرہ گر اسپید است و نو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو!

مرید ہندی: خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

پیر رومی: آدمی دید است ، باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

مریدِ ہندی: گرچہ بے رونق ہے بازارِ وجود
کون سے سودے میں ہے مردوں کا سُود؟

پیرِ رومی: زیرکی بفروش و حیرانی بخر!
زیرکی ظن است و حیرانی نظر!

مریدِ ہندی: ہم نفس میرے سلاطین کے ندیم
میں فقیرِ بے کلاہ و بے گلیم!

پیرِ رومی: بندۂ یک مردِ روشن دل شوی
بہ کہ بر فرقِ سر شاہاں روی

مریدِ ہندی: علم و حکمت کا ملے کیوں کر سُراغ؟
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

پیرِ رومی: علم و حکمت زاید از نانِ حلال!
عشق و رقت آید از نانِ حلال

مریدِ ہندی: ہے زمانے کا تقاضا انجمن
اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن!

پیرِ رومی: خلوت از اغیار باید ، نے زیار
پوستیں بہر دے آمد ، نے بہار

مریدِ ہندی: ہند میں اب نُور ہے باقی نہ سوز!
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز!

پیرِ رومی: کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

محمد شریف بقا کے مطابق:

''پیرِ رومیؒ، مریدِ ہندی بالِ جبریل کی نظم ہے۔ یہ سوالات اور جوابات کی صورت میں ہے۔ اس میں سوالات علامہ اقبالؒ کے ہیں اور اس کے جوابات مولانا روم کے ہیں۔ وہ مولانا

روم ہی کی مثنوی سے لئے گئے ہیں۔ یہاں بھی علامہ نے اپنی بات یا اپنا نقطۂ نظر یا اپنی توضیح اور تبلیغ براہ راست پیش کرنے کے بجائے مولانا رومؒ کو ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے۔۔۔ پوری کتاب ''جاوید نامہ'' مولانا رومؒ ہی کی رہبری میں اور انہیں کے فرمودات کا سہارا لے کر مرتب کی گئی۔''(21)

نظم پیر رومیؒ، مرید ہندی میں جو سوالات اُٹھائے گئے ہیں اور جو جوابات دیئے گئے ہیں وہ علامہ کے معاصر احوال نظریات، افکار اور ان فلسفیوں کی روشنی میں اُٹھائے گئے تھے، یا ردعمل کے طور پر اُٹھائے گئے تھے، جو اولاد آدمؑ کو متاثر کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے مُسلم امت خاص طور پر بے راہ ہو رہی تھی۔ حضرت علاّمہ دیکھ رہے تھے کہ مغربی افکار جس دانش کے پروردہ ہیں وہ دانش مادی مفادات پر استوار ہے۔ نتیجہ یہ کہ مغربی دانش کی مادہ پرستانہ روش اولاد آدمؑ کو روح کی تجلّی سے محروم کر کے مادّے کی ظلمتوں میں بے راہ اور گمراہ کرنے کا باعث بن رہی تھی۔

علامہ اقبالؒ نے اسرارِ خودی کا آغاز مولانا روم کے ان فقید المثال اشعار سے کیا ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملوم و انسانم آرزوست
زیں ہمر ہان سُست عناصرِ دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(مولانا جلال الدّین رومیؒ)

''اسرارِ خودی'' کی تمہید میں اقبالؒ نے رومیؒ کا ذکر بڑے عقیدت و احترام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ پیر حق سرشت (مولانا رومؒ) نے مجھے اس مہر خاموشی کو توڑنے اور یہ مثنوی لکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ میں نے رازِ خودی پر پردہ اٹھایا اور ''سر اعجاز خودی'' بیان کر دیا۔ خود اور اس کے بعد عشق کی قوت و عظمت کا ذکر اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ اقبالؒ نے فلسفۂ خودی اور عشق میں براہِ راست رومیؒ سے فیض اُٹھایا ہے۔ شاعر نے اپنے نقطہ نظر میں قوت یا تاثیر پیدا کرنے کے لیے مثنوی ''اسرارِ خودی'' رومیؒ کے اشعار کی تضمین کی ہے۔۔۔ اقبال نے

مثنوی ''رموزِ بیخودی'' بھی مولانا روم کے شعر سے شروع کی ہے۔(22)

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصّواب

(مولانا رومؒ)

بلکہ ''رموزِ بیخودی'' کے آخر میں بھی رومیؒ کا یہ شعر لائے ہیں:

''مسکنِ یار است و شہر شاہِ من
پیشِ عاشق ایں بود حب الوطن''

''پیام مشرق'' کے آغاز میں بھی علامہ اقبالؒ نے مولانا روم کو اس طرح یاد کیا ہے:

مُرشدِ رومیؒ حکیم پاک زاد
سِرِّ مرگ وزندگی بر ما کشاد
''ہر ہلاکِ اُمّتِ پیشین کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بُردند عود

''پیام مشرق'' کے حصہ افکار میں ''حکمت وشعر'' کے زیرعنوان اقبالؒ نے بوعلی سینا اور رومیؒ کو حکمت اور سوز کی الگ الگ علامت قرار دے کر ابنِ سینا کی ناکامی اور رومیؒ کی کامیابی کا ذکر کیا ہے۔عشق کے عنوان کے تحت مختلف کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے تب وتابِ رومیؒ اور حیرتِ فارابی کو بیان کیا ہے۔اسی کتاب کے حصّہ ''مئے باقی'' میں کئی جگہ غزلوں کے مقطعوں میں پیر روم کا ذکر آیا ہے۔ایک مقطع میں سوز وسازِ رومیؒ کی تمنا کا اظہار یوں کیا ہے:

مطرب! غزلے ، بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم درآتشِ تبریزی

شعر کے ایک مصرعے میں جزوی تضمین کی گئی ہے۔

شعلۂ در گیر زد برخس و خاشاکِ من
مرشد رومیؒ کہ گفت ''منزل ما کبریا ست''

''پیامِ مشرق'' میں اقبالؒ نے ''جلال وہیگل'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔اس میں انہوں نے ہیگل اور رومیؒ کا مقابلہ کر کے رومیؒ کی تابناک فکر کے مقابلے میں ہیگل کے فلسفے کو سراب سے تعبیر کیا ہے۔اس نظم میں اقبالؒ نے پہلی دفعہ مسلسل اشعار کے ذریعے رومیؒ کی فکر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ایک دوسری نظم ''جلال و گوئٹے'' میں پیر عجم کے حیات آفرین کلام کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

رومیؒ کے ساتھ اقبالؒ کی عقیدت مندی ان کے ہر مجموعۂ کلام میں پائی جاتی ہے۔''زبورِ عجم'' کی بہت سی غزلوں میں رومیؒ کے وجد و مستی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''گلشن راز جدید'' اور ''بندگی نامہ'' میں رومیؒ کے سوز و سازِ دروں اور افکارِ بلند کا ذکر ہے۔''گلشن راز جدید'' کے خاتمے میں جہاں اقبالؒ اپنے قاری کو خودی اور سوزِ قلب کی قوت سے تسخیر کائنات کا جذبہ پیدا کر رہا ہے وہاں اسے اپنے سوزِ دل سے بہرہ ور ہونے کی دعوت بھی دے رہا ہے کہ اس کا دل بھی قلب رومیؒ کی طرح سوز گداز سے معمور ہے۔''بندگیٔ نامہ'' میں در بیانِ فنون لطیفۂ غلامان ''_____'' ''موسیقی'' میں رومیؒ کو اپنے افکار کا سرچشمہ بتاتے ہوئے پیر رومؒ کے دو اشعار کی تضمین کر کے اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے:

مرگ ہا اندر فنونِ زندگی
من چہ گویم از فسونِ زندگی
نغمۂ او خالی از نارِ حیات
ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات
ناتوان و زار می سازو ترا
از جہاں بیزار می سازو ترا
نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست
سوزِ او از آتش افسردہ ایست
رازِ معنی مرشد رومیؒ کشود
فکرِ من بر آستانش در سجود

''معنی آں باشد کہ بستاند ترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند
مرد را بر نقش عاشق تر کند
مطربِ ما جلوۂ معنی ندید
دل بصورت بست و از معنی رمید

علامہ اقبال رومیؒ کے ساتھ عقیدت میں عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور ''جاوید نامہ'' تک پہنچتے پہنچتے جوش اور اشتیاق کی لہر تیز ہو جاتی ہے یہاں رومیؒ صحیح معنوں میں اقبال کے رہبر و رہنما کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ رومیؒ، اقبالؒ پر اسرارِ زندگی کھولتے ہیں۔ اقبالؒ ایک عقیدت مند رومیؒ کی طرح رومیؒ کے افکار سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ کتاب کی تمہید میں رومیؒ کے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی گئی ہے:

''ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را''

سفر افلاک شروع ہونے سے پہلے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر رومیؒ حسبِ ذیل غزل گنگناتے ہیں:

''بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست
بنمائے رُخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلمِ اُو
آں نورِ حبیبِ موسیٰ عمرانم آرزوست
گفتم کی یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست''

(مولانا رومیؒ)

پھر دفعتاً رومیؒ کی روح پہاڑ کے دوسری طرف نمودار ہوتی ہے۔ آتے ہی روح فلسفیانہ گفتگو کا ایک سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ اس دوران میں اقبالؒ، رومیؒ کے کئی اشعار کو اپنے کلام میں سموتے ہیں اور کئی کی تضمین کرتے ہیں۔ سفر کے دوران شاعر کو پیر رومیؒ کی رہنمائی حاصل رہتی ہے۔ اور جہاں جہاں مکالمات اور سوال و جواب اور

واقعات کے بیان میں رومیؒ کا ذکر آتا ہے۔ شاعر سراپا عقیدت و نیاز بن جاتا ہے۔ افلاک پر مختلف شخصیات سے ملاقات کے دوران میں بھی شاہ، رومیؒ کے اشعار یا مصرعوں کو ورد زبان کرتا ہے۔

''خطاب بہ جاوید'' میں شاعر نژادِ نو سے خطاب کرتے ہوئے افکارِ رومیؒ سے رہنمائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

پیر رومیؒ را رفیقِ راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومیؒ مغز را داند ز پوست
پای او محکم فتد در کوی دوست
شرح او کردند او را کس ندید
معنیٔ او چوں غزل از مارمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند
چشم را از رقصِ جاں بردوختند

(کلیاتِ اقبال، فارسی)

''جاوید نامہ'' کا آغاز و اختتام رومیؒ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ مثنوی ''مسافر'' میں شاعر نے خرقۂ مبارک کی زیارت کے بعد جذب و مستی کے عالم میں ایک پُرسوز غزل کہی ہے۔ جس میں رومیؒ کے عشق آمیز اور عشق آموز افکار کی اشاعت پر زور دیا ہے۔

وقت است کہ بکشائم مے خانۂ رومیؒ باز
پیرانِ حرم دیدم درضمنِ کلیسا مست

''پس'' چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں پیر رومیؒ کے ذکر سے یوں تمہید شروع کی ہے:

پیر رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
نورِ قرآں درمیان سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

علامہ اقبالؒ نے دین وسیاست کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے رومیؒ کے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ مثنوی ''دراسرارِشریعت'' تحت موضوع کا آغاز رومیؒ کے ذکراوراس شعر سے کیا گیا ہے:

نکتہ ہا از پیر روم آموختم
خویش را در حرف او وا سوختم
درحضورش بندہ می نالہ چوں نے
بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے
پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات
فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں
جُز بہ اعماقِ ضمیر خود مبیں
اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم
تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
کارِ اقوام و ملل ناید درست
از عمل بنما کہ حق در دستِ تست (کلیاتِ اقبال، فارسی)

''ارمغانِ حجاز'' اقبالؒ کا آخری مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں اقبالؒ نے ''رومی'' کے زیرعنوان دس رباعیاں لکھی ہیں۔ ان رباعیوں میں رومیؒ کو بے مثال شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ یہ رباعیات اقبالؒ کو رومیؒ کو آخری ہدیۂ عقیدت ہیں۔ اقبال کی رومیؒ سے عقیدت کا پتا ان کی بیاض اوران کے مکتوبات سے بھی پتہ چلتا ہے۔ 19 مارچ 1935ء کو حکیم محمد حسن قرشی کو لکھا کہ: ''ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر رکھا ہے اور کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن پاک اور مثنوی رومیؒ''۔

رومی کے ساتھ اقبالؒ کی عقیدت کی وجہ یہ تھی کہ جو سوز وغم اور ولولہ وجوش رومیؒ کے کلام میں تھا۔ وہ دوسرے شعراء کے ہاں مفقود تھا۔ دوسرے رومیؒ کا دور سیاسی لحاظ سے بہت پُر آشوب تھا۔ معاشرہ فکری، روحانی، اخلاقی اور مادی لحاظ سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ رومیؒ اپنے کلام سے قوم کی مردہ زندگی میں حرارت اور نمو پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ٹھیک سات سو سال بعد اقبالؒ کو بھی انہیں حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اقبال دور بھی امت مسلمہ کے زوال وادبار کا دور

تھا۔ مغرب نے مشرق کو علمی، فکری اور سیاسی محاذ پر شکست دے کر اسے بے دست وپا کر دیا تھا۔ مسلمان عجیب وغریب رسم ورواج کا پابند ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے لیے انہیں رومیؒ سے زیادہ فکری رہنما کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔

چوں رومیؒ در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من

....

بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

....

عطا کن شور رومیؒ ، سوزِ خُسروؒ
عطا کن صدق و اخلاق سنائی

....

ز رومیؒ گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسود امیری

اقبال کا فلسفۂ خودی رومیؒ کے افکار عالیہ سے ماخوذ ہے۔ دونوں کے فلسفیانہ نظام کا مرکز ومحور محنت، کوشش اور عمل ہے۔ یہ چیزیں انسان کے ارتقاء میں مدد لیتی ہیں۔ رومیؒ شر کی قوتوں سے مسلسل جنگ کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی جدوجہد انسان کو مزید آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ رومیؒ کا خیال ہے کہ انسان جتنا عظیم ہوگا، شر سے نبرد آزما ہونے کی قوت، اس میں اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

درحقیقت ہر عدو داروی تست
کیمیای نافع و دلجوئی تست
زین سبب بر انبیاء رنج و شکست
از ہمہ خلقِ جہان افزوں ترست

اقبالؒ بھی جمود وسکون کے خلاف ہیں۔ ان کا سارا کلام ذوقِ عمل اور جوش کردار سے معمور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خود اپنی اپنے تحفظ کے لیے غیر خودی سے ٹکراتی ہے۔ اور وہ تبھی کامیاب ہوتی ہے جب وہ غیر خود سے ٹکرا کر

اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر لے۔ خودی جتنی مضبوط ہوگی مصارفِ زندگی میں وہ اتنی ہی کامیاب ہوگی۔

رومی اور اقبالؒ دونوں خودی کے استحکام کے ساتھ ساتھ انفرادی خودی کے بھی قائل ہیں۔ اقبالؒ نے وحدت الوجود کے فلسفے کو بھی اُمت مسلمہ کے زوال کا ایک سبب گردانا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ نے تقویم خودی اور ادعائے ذات پر زور دیا ہے۔ رومیؒ نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے لوہے اور آگ کی تمثیل سے کیا ہے۔ رومیؒ کا خیال ہے کہ لوہا آگ میں پڑنے کے بعد اس کی تمام صفات اخذ کر لیتا ہے۔ اور بظاہر اس کا وجود بھی مٹ جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پانی منفرد شخصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

اقبال کا خیال ہے کہ انسان اپنے اعمال میں کافی حد تک مختار ہے۔ اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ ایک تقدیر کی ناکامی کی صورت میں انسان حضورِ حق سے دوسری تقدیر کا تقاضا کر سکتا ہے۔

اقبالؒ اور رومیؒ دونوں کے یہاں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں نے عشق کو وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ دونوں عشق کو زندگی کی قوت محرکہ قرار دیتے ہیں۔ رومیؒ نے روح کو ایک نَے سے تشبیہ دی ہے۔ جو اپنے اصل کی طرف لوٹنے کے لیے بے تاب ہے۔ گویا عشق کا جذبہ انسان کو آہستہ آہستہ منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ حرکت ارتقاء کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ یہ حرکت زندگی میں نشو ونما اور بالیدگی کا باعث بنتی ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق:

> ''مولانا کے کلام میں حکمت اور علم کلام کے بڑے بڑے مسائل شعری زبان میں ادا کیے گئے ہیں۔ صفات باری، نبوت، روح، معاد، جبر وقدر، تصوّف، وجد اور علمی موضوعات میں سے تجدد امثال اور مسئلہ ارتقاء جیسے اہم مسائل کی تعبیر موجود ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ صدیوں سے فکر اسلامی پر مولانا کے افکار اثر انداز ہیں، چنانچہ ہر دور میں مثنوی کا مطالعہ جاری رہا۔ بے شمار شرحیں اور قریب ترین دور میں ترکی، ایران، پاکستان اور ہند میں ترجمے ہوئے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں مثنوی مولانا روم کا شمار ادبیات فارسی کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کی لاتعداد شرحیں، ترجمے اور فرہنگ لکھے گئے ہیں۔'' (23)

ڈاکٹر محمد اکرم کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیات کے تذکرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے مثنوی کو اثباتی فکر وعمل کی کتاب قرار دیا اور اس کے فیض کی نئی نئی حدود دریافت کیں۔ انہوں نے بتایا کہ قرآن کے بعد جس کتاب کے ذریعے زمین وآسمان کو تسخیر کرنے

والے علوم وحکمت تک رسائی ہوتی ہے۔ وہ مثنوی ہے اور اس میں عصر حاضر کے ان پیچیدہ مسائل کا حل بھی موجود ہے جن سے انسان حواس بافتہ ہو کر اپنی تقدیر سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی بدولت ایک دبستان رومیؒ کی بنیاد پڑی اور اقبالؒ کے خاص نقطۂ نظر سے افکار رومیؒ کا تجزیہ ہونے لگا۔'' (24)

عام صوفیہ نے فنا اور ترک دنیا پر زور دینا تعلیم کا مقصود بنالیا تھا۔ مولانا رومؒ نے اس کو بقا اور ارتقا کے نظریے سے بدل دیا۔ رومیؒ کے ہاں خودی کا استحکام لازمی ہے۔ ان کا طریقہ قوت تسخیر میں اضافہ کرتا ہے۔ عجمی تصوّف نے ترکِ حاجات کو خدارسی قرار دیا تھا۔

رومیؒ کہتے ہیں حاجت تو مصدر وجود اور منبع بہبود ہے۔ خدا کی خوبی ہے کہ بے نیاز ہے۔ بندے کی بندگی حاجات طلبی سے وابستہ ہے۔ لیکن مولانا رومیؒ اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ حاجات پست اور حیات کش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہییں۔ مولانا رومیؒ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان عبث پیدا نہیں کیے بلکہ کسی حاجت ہی سے کیے ہیں۔ اسی خیال کو اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ زندگی اور حیات و کائنات عبث نہیں ہیں اور نہ ہی خواہشات اور آرزوئیں عقل وحکمت کے منافی ہیں بلکہ زندگی کی بقا بلند اور ارفع مقاصد اور آرزوؤں سے وابستہ ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

زندگانی را بقا از مدعا ست
کاروانش را درا از مدعا ست

.....

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کے ہاں زندگی اور خودی کی اصل عشق ہے۔ علم، عقل وحکمت کے ساتھ ساتھ عشق زندگی کی بقا اور ارتقاء کا ضامن ہے۔ عقل عشق کی آلہ کار ہے۔ دونوں کے ہاں عشق کا مفہوم عشق کے عام مفہوم سے منفرد اور الگ معنوں میں ادا ہوا ہے۔ رومیؒ اور اقبالؒ کا عشق خودی میں خدا تعالیٰ کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ رومیؒ نے اس دور کے صوفی مائلاً اور حکیم کے عقیدہ جبر اور تقدیر کے غلط مفہوم کی بجائے انسان کی خودی اور

اختیار پرستی کا تصور پیش کیا۔ اقبالؒ کے ہاں بھی یہی تصور ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے ایک شُذرہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور سماجی، روحانی اور نظریاتی مسائل کے مطابق زندگی کے گہرے حقائق کا ادراک کیا، سادہ اور دلچسپ حکایات کی صورت میں اپنی بے پناہ ذہانت اور فطانت سے واضح کیا۔ رومیؒ نے دین کے اصولوں کو عام حکایات اور تمثیلات کے موثر پیرائے میں بیان کیا اور روحانی انتشار کے دور میں ملت کو مثبت رجحانات سے روشناس کیا جو ان کی خداداد ذہانت کی بڑی دلیل ہے۔

رومی نے مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام فلسفہ دانی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی اہلیت پیدا کرنے کا نام ہے:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

اسی لیے اقبالؒ نے ''دید'' کو مقصدِ حیات قرار دیا ہے اور اس دید کا طریقہ عشق ہے۔ اور اس دید کا طریقہ عشق ہے۔ اس لیے مرشد رومیؒ نے دنیا کو عشق کا پیغام دیا ورانہی کی تقلید اس زمانہ میں اقبالؒ نے کی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ''ضربِ کلیم'' کی نظم رومیؒ میں مسلمانوں کو رومیؒ کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمہ رومیؒ سے بے نیاز اب تک

علامہ اقبالؒ اپنے تمام فارسی، اُردو اور انگریزی افکار نظم و نثر میں مولانا روم ہی کے معتقد اور انہیں پر دل و جان سے فریفتہ نظر آتے ہیں اور یہاں تک ان کا اتباع کرتے ہیں کہ بعض بندشوں کی کمزوریوں میں بھی وہ رومیؒ کے پیروکار دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کے دوست سیّد سلیمان ندویؒ ان کے بعض اشعار پر انہی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ قافیے کمزور ہیں تو وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے اس والہانہ عقیدت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تسامح

انہوں نے دیدہ دانستہ پیر رومیؒ کی تقلید میں روا رکھا ہے۔

مولانا رومیؒ سے اقبالؒ کو بے حد عقیدت ہے۔ وہ انہیں پیر طریقت مانتے ہیں اور ان کے ارشادات کو قابلِ تعمیل سمجھتے ہیں۔ فرمودات کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا یہ اظہارِ عقیدت لفظی نہیں۔ انہوں نے مولانا روم کے نظریات کو فی الواقع اپنایا اور پھیلایا۔ ان کی رہنمائی قبول کی۔ علامہ اقبالؒ کا اُردو اور فارسی کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے مختلف انداز سے مولانا رومیؒ کی بارگاہ میں گل ہائے عقیدت پیش نہ کیے ہوں۔

علامہ اقبالؒ مولانا روم کو اپنی نادرالوجود ذہانت کی بنا پر اپنی قوم کی اصلاح سادہ حکایتوں اور اخلاقی تعلیمات سے کرنے پر زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو مولانا رومیؒ سے بے پناہ عقیدت ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد ریاض اقبالؒ کی تصنیف ''علم الاقتصاد'' کے علاوہ ان کی کوئی کتاب (منظوم و منثور) رومی کے ذکر سے خالی نہیں۔

مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کے اشتراک ذہنی کے متعلق ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دونوں نے زندگی میں کوشش طلب، جدوجہد اور کشمکش و پیکار کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ راہ کی مزاحمتی قوتوں، دشواریوں اور رکاوٹوں کو منفی نہیں بلکہ مثبت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مزاحمتیں اور رکاوٹیں انسان میں خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتی اور اسے عمل پر ابھارتی ہیں۔ اور اس کے اندر شوکت، جلال، قوت ایسی صفات پیدا کرتی ہیں جو نصب العین کے حصول کے لیے بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک مثالی انسان محض طاقت و شہ زوری کا مجسمہ نہیں بلکہ اس میں سوز و گداز، دل کی نرمی بھی پائی جاتی ہے جو اس میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔۔۔ دونوں شخصیتیں اپنے زمانے کے حالات سے شدید متاثر ہیں۔ اس کے علاوہ تربیت روحانی کے لیے مرشد کی زیارت اور اہمیت کے قائل ہیں۔ اور دونوں کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی ذات ہی ایسی ہستی ہے جس کا اتباع نسلِ انسانی کو معراج انسانیت کے قریب تر پہنچا سکتا ہے۔

مشت خاکے خود را بردہ پیش
در تماشائے تجلی ہائے خویش!

اقبالؒ اور رومیؒ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بلکہ ایک قالب دو جان، لازم ملزوم۔ اس لیے جو ایک کی طرف رجوع ہو، وہ دوسرے کی طرف رجوع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر محمد سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ اگر رومیؒ نے اقبالؒ کے فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبالؒ نے بھی رومیؒ کے افکار عالیہ کو بڑی عزت وشان سے دنیا میں متعارف کرایا۔ جس سے ان کے مرتبہ ومقام کو پہلے سے کہیں زیادہ سربلندی نصیب ہوئی۔ یہ اقبالؒ کی سعادت مندی ہے کہ وہ رومیؒ کی غائبانہ شاگردی سے مفتخر ہوئے۔ مگر یہ فکر رومیؒ کی بھی خوش نصیبی ہے کہ اس کو اقبالؒ جیسا ہوشمند اور بالغ نظر شارح ملا جس نے اپنے نامور اُستاد کی عظمت کے مینار اور اونچے کر دیئے اور ان کی شہرت کو فلک الافلاک تک پہنچا دیا۔''(25)

اقبالؒ نے رومیؒ سے خود ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ ایک دبستانِ فکر رومیؒ کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ اس کے زیر اثر رومیؒ کے مطالعے وتجزیہ کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا۔ خط بنام لسان العصر اکبر الہ آبادی مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۱۸ء لکھتے ہیں: کل مثنوی مولانا روم دیکھ رہا تھا کہ یہ شعر نظر پڑھا:

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر ہم بر فکر دیگر می چرد

سبحان اللہ! ایک خاص باب میں انہوں نے یہ عنوان قائم کیا کہ باری تعالیٰ کے سوا ہر ہستی آکل وماکول ہے اور اس ضمن میں شوپن ہار (فلاسفر جرمنی) کے فلسفے کو اس خوبی سے نظم کر گئے ہیں کہ خود شوپن ہار کی روح پھڑک گئی ہو گی۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کے ذہنی روابط کے سلسلے میں ڈاکٹر ملک حسن اختر کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

ظاہر ہو جاتا ہے کہ اقبالؒ رومیؒ کو کس قدر چاہتے ہیں اور ہر معاملے میں رومیؒ کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔ انہوں نے رومیؒ کے کالم کی تشریح وتوضیح اس طرح کی کہ رومیؒ دور جدید کے رہنما کی حیثیت اختیار کر گئے۔۔۔ علامہ اقبالؒ رومیؒ کے کلام کی شرح کی طرف اس لیے متوجہ ہوئے کہ ان کے ہاں عصر حاضر کے مسائل کا حل ملتا ہے اور بڑی حد تک علامہ کے نظریات سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مرید کی طرح رومیؒ سے سوال کرتے ہیں اور ان کے جوابات سے اپنی ذہنی پیچیدگیوں کو سلجھاتے ہیں۔

عارف سیالکوٹی اپنے مضمون ''اقبال اور رومیؒ'' میں علامہ اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کی فکری ہم آہنگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیر رومیؒ اور مرید ہندی میں کئی امور میں نمایاں مماثلت ہے۔ دونوں میں متعدد موضوعات واقدار مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قوتِ اشراق (باطنی حِس کی مخفی قوت) نظریہ ارتقاء، عشق کی معجزانہ تخلیقی قوتیں، جبر وقدر کا مسئلہ، اثباتِ خودی، شرف انسانیت وغیرہ۔ دونوں ممتاز، منفرد، صاحبِ طرز، بلند پایہ اور اعلیٰ درج کے اسلامی فلسفی اور شاعر ہیں۔ دونوں عظیم مفکر بھی ہیں۔ ان کے اشعار وافکار حکمت ومعرفت کا خزینہ ہیں۔۔۔ دونوں نے ملت اور انسانیت کے محبت بھرے میٹھے نغموں سے نوازا۔ معقولات پر وجدانیات کو ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں خودی کی تقویت کے خواہاں ہیں۔ تقدیر کے معاملے میں تقریباً ہم آہنگ ہیں۔ ارتقاء پسند ہیں، جہد مسلسل اور سعیِ پیہم کو زندگی اور جمود تعطل اور خفتگی کو موت سمجھتے ہیں۔ اقبالؒ بھی رومیؒ کی طرح جا بجا خدا سے شوخیاں کرتے ہیں۔''(26)

علامہ اقبالؒ نے 1935ء میں بنام حکیم محمد حسین اپنے ایک خط میں لکھا:

''رومی کو پڑھنے سے اگر قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے۔ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔''(27)

ڈاکٹر عبدالشکور احسن، علامہ اقبالؒ اور مولانا روم کے فلسفۂ عشق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رومی اور اقبالؒ دونوں کے فلسفے میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں عشق کو ایک وسیع تر مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اسے کائنات کی روح رواں سمجھتے ہیں۔ اسی سے اسرارِ حیات آشکار ہوتے ہیں۔ یہی زندگی کی قوت متحرکہ ہے اور اسی کے تارِ حیات میں مضراب سے تارِ حیات میں نغمہ ہے۔''(28)

اگرچہ علامہ اقبال کی تمام تصانیف میں رومیؒ سے ان کی ذہنی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے مگر اثر رومیؒ کی معراج ''جاوید نامہ'' میں نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انہیں اپنے مرشد رومیؒ کا یہ مقولہ ''آدمی دیدست باقی پوست است'' بڑی شدت کے ساتھ یاد آتا ہے، چنانچہ وہ دیدار دوست کے لیے بے قرار ہو کر آسمانوں کی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس

معنوی سفر میں رومیؒ شروع سے ان کے ساتھ ہیں۔''

نگہت پروین کے مطابق:

''علامہ اقبالؒ کو مولانا روم سے خاص عقیدت و محبت تھی ان کی شخصیت کی کردار سازی میں مولانا روم کی مثنوی معنوی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے اردو و فارسی کلام میں مولانا رومیؒ کا ذکر بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ اشعار میں ان کا ذکر بڑی کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ عقیدت و محبت کا رشتہ مولانا روم کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی گہری ذہنی وابستگی کا پتا دیتا ہے۔ اگر اقبالؒ کی مولانا روم نے فکری رہنمائی کی تو اقبالؒ نے بھی مولانا روم کی شخصیت اور اہمیت کو روح عصر بتا کر مولانا روم کو پھر عظمت کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔''(29)

رومیؒ ایسے علم کو پسند کرتے ہیں جو باطنی اسرار و حقائق کے ادراک کا باعث بنتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ خطرناک ہوتا ہے اور سانپ کی طرح ڈستا ہے۔

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را دل زنی یاری بود

مولانا روم کہتے ہیں کہ عشق لاابالی فطرت کا مالک ہوتا ہے جب کہ عقل مصلحت اندیش ہوتی ہے:

لا ابالی عشق باشد نے خرد
عقل آں جوید کزاں سودی برد

اقبالؒ بھی عقل و خرد کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں:

عقل عیار ہے سو بھیس بدلتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

علامہ خالص مادی علم کو ''نخل بے رطب'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عقل مادی معاملات سلجھاتی ہے اور انسان کی رہنمائی تو کرتی ہے مگر بذات خود منزل نہیں ہے۔

رومی اور اقبالؒ کی نظر میں موت، زندگی جاوداں کی ایک منزل ہے۔ اس لیے انسان کو اس خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ رومیؒ زندگی کو ارتقاء پذیر سمجھتے ہیں:

از جمادی مردم و نامی شدم
و زنما مردم بہ حیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمردن کم شدم
جملۂ دیگر بمیرم ازبشر
تا بیارم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک قربان شدم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
وزملک ہم بایدم جستن زجو
کل شی ھالک الا وجھہ

اقبالؒ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ موت قابلِ التفات نہیں ہے اور زندگی مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ ان کے خیال میں موت صید اور انسان صیّاد ہے:

از مرگ ترسی ای زندہ جاوید
مرگ استی صیدی تو درکمینی
جانی کہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم عبیرد از بی یقینی

اقبالؒ کے مردِ کامل کی جھلک رومیؒ کے کلام میں بھی موجود ہے۔ وہ ایسے انسان کی تلاش میں ہیں جو روحانی، اخلاقی اور جسمانی قوت کا پیکر ہو:

پس بصورت عالم اصغر توئی
ہم بمعنی عالم اکبر توئی
آں منی و ہستیت باشد حلال
در ریاض سرمدی قصری بساخت

ای خنک آن را کہ ذاتِ خود شناخت
کہ درآں بنی سرمدی قصری بساخت
آدمی چو نور گیرد از خدا
ہست مسجودِ ملائک اجتبا

اقبالؒ کا مردِ مومن بھی انہی صفات کا پیکر ہے:

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تاز تو گردد جلالش آشکار
بندہ ٔ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ اوکس را غلام
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

اقبالؒ کا ایک موضوع تسخیر کائنات ہے۔ آدم خاکی راکب تقدیر ہے اور پوری کائنات اس کے تصوّف میں ہے:

نائب حق درجہاں بودن خوش است
برعناصر حکمراں بودن خوش است

.....

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہیں ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

.....

ہیں تیرے تصوّف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک ، یہ خاموش فضائیں

اقبالؒ اور رومیؒ دونوں ایسے شاعر ہیں جن کا عہد آشوب اور بدامنی سے بھرا پڑا تھا۔ دونوں نے معاشرہ کو سدھارنے کے لیے ایک ضابطۂ حیات اپنی ملت کو پیش کیا۔ یہ دونوں اپنی امت کے روشن مستقبل کے بارے میں پُر امید تھے۔ لیکن انہیں اس بات کا افسوس بھی تھا کہ لوگوں نے ان کے افکار کا پورا ادراک نہیں کیا۔ رومیؒ نے کہا:

ہر کسی از ظن خود شد یار من
وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

مولانا رومیؒ کے افکار وخیالات کو اقبالؒ نے یوں ادا کیا ہے:

چوں رخت خویش بر بستم ازین خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولی کس ندانست این مُسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اقبالؒ نے غزلیات میں بھی رومیؒ کا تتبع کیا ہے اور رومیؒ کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ اقبالؒ کی بعض غزلیں ایسی ہیں جو رومیؒ کی زمین میں تو نہیں لیکن ان میں رومیؒ کا انداز صاف نظر آتا ہے:

صورت نہ پرستم من ، بت خانہ شکستم من
آں سیل سُبک سیرم ، ہر بند گستم من

.....

من اگرچہ تیرہ خاکم است برگ و سازم
بہ نظارہ جمالم چو ستارہ دیدہ بازم

.....

بر عقل فلک پیما ترکانہ شبخوں بہ
یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطون بہ

.....

از چشم ساقی مست شرابم
بی می خرابم، بی می خرابم

.....

بدہ آں دل کہ مستی ہای او از بادہ خوش است
نگراں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است

.....

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم زخودی خدا طلب

.....

انجم بگریباں ریخت ایں رہ دیدہ ٔ تر مارا
بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر مارا

اقبالؒ صرف رومیؒ کے افکار وخیالات ہی سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ انہوں نے رومیؒ کی روح کو اپنے کلام میں بھی سمونے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؒ نے نہ صرف خود رومیؒ کے افکار سے رہنمائی حاصل کی بلکہ انہوں نے رومیؒ کے فلسفہ کو اہلِ علم کے سامنے پیش کیا، اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی تلقین کی۔ اور یوں رومیؒ کو آفاقی شاعر بنا دیا۔ انہوں نے رومیؒ کو دائرہ صوفیہ سے باہر نکالا اور لوگوں کو بتایا کہ رومیؒ محض صوفی یا شاعر نہیں بلکہ ایسے مفکر ہیں جن کے کلام میں اسلامی روح موجود ہے۔ جن کا دل ملّت اسلامیہ کی اصلاح کے لیے بے تاب ومضطرب ہے۔ ان کے کلام میں جوش، تڑپ، سوز وگداز اور جدتِ افکار ہے۔ ان کا کلام ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

تقدیر کے مسئلے پر بھی دونوں عظیم شخصیات متفق ہیں۔ رومی فطرت کے قوانین کو اٹل اور لازوال سمجھتے ہیں۔ ان کی روشنی میں اعمال کو ترتیب دینا ہی تقدیر انسانی ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں ''مرید ہندی'' پیر رومی سے جبر وقدر کے بارے میں سوال کرتا ہے تو پیر رومیؒ یوں جواب دیتے ہیں:

بال بازاں را سوی سلطان بُرند
بال زاغاں را بگورستان بُرند

مولانا روم اختیار کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

اختیار آمد عبادت را نمک
ورنہ می گردد بناگاہ ایں فلک
گردش او را نہ اجر و نے عقاب
کہ اختیار آمد ہنر وقتِ حساب

مولانا رومیؒ کے خیال میں مردِ کامل کا جبر قوت کا باعث بنتا ہے۔ جس کے سہارے اپنی شخصیت یا خودی کی پرورش اور تحفظ کرتا ہے۔ کاہل کے لیے یہی چیز مجبوری اور قید و بند کا نام ہے دوسرا نام ہے۔

جبر باشد بال و پر کاملاں
جبر ہم زنداں و بید کاہلاں
ہم چو آب نیل داں ایں جبر را
آب مومن را و خون موگیر را

حواشی وحوالہ جات

1- شیخ نجم الدین، کُبریٰ، شہادت 618ھ (22-1221ء) نفحات الانس، اُردو ترجمہ، ص: 453

2- ملاطیہ (ترکی کا ایک مشہور شہر ہے)

3- اعجاز الحق، قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیاء (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری 1976ء، ص: 151، 152)

4- برہان الدین محقق، سیّد، ترمذ کے رہنے والے تھے۔ اُن کا مزار دارالفتح قیصریہ میں ہے۔ (نفحات الانس۔ اُردو ترجمہ، ص: 488، 489)

5- شبلی نعمانی، مولانا، سوانح مولانا رومؒ (ص: 18)

6- مناقب العارفین، مطبوعہ ستارۂ ہند (آگرہ، بھارت، ص: 56، 57)

7- بابا کمال خجندی: نے علوم باطنی کی تکمیل شیخ نجم الدین کُبریٰ سے کی تھی۔ اُن کے ارشاد کے مطابق ترکستان میں مولانا شمس الدین مفتی کے صاحبزادے جن کا نام احمد تھا اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے شیخ کا خرقہ انہیں پہنچایا۔ اور اپنے مُرشد کے حکم کے مطابق اُن سے تربیت حاصل کی۔ (نفحات الانس، اُردو ترجمہ، ص: 262، 263)

8- شبلی نعمانی، مولانا (اُردو کا کلاسیکی ادب) مرتبہ، سیّد عابد علی عابد، (لاہور، مجلس ترقی ادب، اپریل 1971ء، ص: 28)

9- شمس تبریز کے والد کا نام علاؤ الدین تھا۔ وہ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے۔ (دیباچہ مثنوی نفحات میں لکھا ہے کہ شمس کا کیا بزرگ کے خاندان سے ہونا غلط ہے) جو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام تھا۔ لیکن انہوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ شمس نے تبریز میں علوم ظاہر کی تحصیل کی۔ پھر بابا کمال الدین خجندی کے مرید ہوئے۔ لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی اور بیعت وارادت کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے۔ جہاں جاتے کارواں سرائے میں اُترتے اور حجرے کا دروازہ بند کر کے مراقبے میں مصروف رہتے۔ معاش کا یہ طریقہ رکھا تھا کہ کبھی کبھی ازار بند بُن لیتے اور اس کو بیچ کر کفاف مہیا کرتے۔

10- صلاح الدین زرکوب: شیخ صلاح الدین فریدوں قونیوی معروف بہ زرکوب ابتداً سیّد برہان الدین محقق کے مرید تھے۔ ایک دفعہ مولانا زرکوبوں کے محلے سے گزر رہے تھے۔ ان کی ضرب کی آواز سے مولانا پر حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ صلاح الدین زرکوب یہ دیکھ کر دکان سے باہر کود پڑے۔ اور مولانا کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ مولانا نے اُن کو آغوش میں لے لیا۔ شیخ زرکوب نے فرمایا دکان لُوٹ لو اور دونوں جہاں سے آزاد ہو گئے اور دس سال تک مولانا کی خدمت میں رہے۔ جب سُلطان ولد بالغ ہوئے تو مولانا نے اُن کی شادی حضرت صلاح الدین زرکوب کی صاحبزادی سے کی۔ اور چلپی عارف اس دختر کے بطن سے پیدا ہوئے۔ شیخ صلاح الدین زرکوب نے یکم محرم 657ھ کو وفات پائی۔ (نفحات

الانس۔اُردوترجمہ،ص:497)

11- افضل اقبال، ڈاکٹر، مولانا رومی، حیات وافکار، مترجم: بشیر محمود اختر (لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 2002ء، ص:126، 127)

12- اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیاء (لاہور، اقبال اکادمی، 1976ء، ص:175)

13- بیگم صفیہ تمنائی، ڈاکٹر، مسلمانانِ ہند پر مولانا رومی کے اثرات، ماہ نامہ شاہ کار میگزین (لاہور، جلد نمبر 2، شمارہ نمبر 6، فروری 2007ء، ص:7)

14- بیگم صفیہ تمنائی، ڈاکٹر، مسلمانانِ ہند پر مولانا رومی کے اثرات، ماہ نامہ شاہ کار میگزین (ص:9)

15- فرقان حمید، ڈاکٹر، مولانا جلال الدین رومی، سہ ماہی معاصر انٹرنیشنل (لاہور، شمارہ نمبر 2، جلد نمبر 1، 2001ء، ص:106)

16- شبلی نعمانی، مولانا، مولانا روم (لاہور، دارالشعور، مزنگ روڈ، ستمبر 2006ء، ص:77)

17- محمد ریاض، ڈاکٹر، رومی کا تصورِ فقر (لاہور، مقبول اکیڈمی، 1990ء، ص:246)

18- حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیات اقبال، فارسی، (لاہور، مکتبہ دانیال، ص:184)

19- عبد الرفیع حقیقت (رفیع) تالیف ایران از دیدگاہ علامہ محمد اقبال لاہوری، (تہران، ایران، طبع شرکت مؤلفان و مترجمان، شمارہ نمبر 21)

20- خورشید حسین، بخاری، سید، پروفیسر، ''اقبالؒ اور رومیؒ''، تحقیقی و تخلیقی ادبی مجلّہ لبِ جو (گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج۔ سانگلہ ہل، نومبر 2002ء، ص302)

21- محمد شریف بقا (شرح۔ پیر و مرید مکالمہ) مکتبۂ تعمیرِ انسانیت (لاہور، اُردو بازار، 1988ء، دیباچہ، ص:4)

22- خورشید حسین، بخاری، سید، پروفیسر، ''لب جو'' (سانگلہ ہل، گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج، نومبر 2002ء، ص:303)

23- اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر 7، ص:324، 327)

24- محمد اکرم، ڈاکٹر، کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیات کا تذکرہ اور اقبال کے اُن کے ساتھ ذہنی روابط (مقالہ پی ایچ ڈی اقبالیات، اسلام آباد، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2004ء، ص:412)

25- محمد عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام (ماہ نو، ستمبر 1977ء، ص:117)

26- عارف سیالکوٹی، اقبالؒ اور رومیؒ، سہ ماہی مجلّہ اقبال (لاہور، بزمِ اقبال، اکتوبر، 1978ء، ص:8)

27- علامہ اقبال، ڈاکٹر، مکتوب بنام حکیم محمد حسین عرشی مشمولہ کلیات مکاتیب اقبال، (جلد چہارم)، مرتبہ سید مظفر حسین برنی (دہلی، اردو اکادمی، 1998ء، ص:96)

-28 احسن عبدالشکور، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص:366)

-29 نگہت پروین، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق معہ مسافر (فکری وفنی جائزہ) مقالہ ایم۔فل اقبالیات (اسلام آباد، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 2003ء، ص:61)

باب پنجم

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ
کے کلام میں فقر کی اہمیت

مولانا روم کا تصورِ فقر:

حضرت شمس تبریزؒ سے ملاقات سے قبل رومیؒ ایک جیّد عالم، فلسفی اور متکلّم تھے۔ اور اس طرح ان کی زندگی کے معمولات چل رہے تھے۔ 38 سال کی عمر میں اُن کی ملاقات حضرت شمس تبریزؒ سے ہوئی جو بابا کمال خجندی کے مُرید تھے۔ شمس تبریزؒ کی ملاقات نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ اب ایک بیدار دل صوفی بن گئے۔ اور ان کی زندگی کے آخری سال اسی شاندار حالت میں گزرے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ ہر قسم کی مذہبی گروہ بندی اور صوفیانہ فرقہ آرائی کے مخالف تھے، مولانا کی پنج گانہ تصانیف میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے رہنما اصول ملتے ہیں۔ وہ عظمت انسان کے قائل ہیں۔ اور وہ اس کے لیے انسانی تگ و دو اور انسانی جدوجہد کا درس دیتے ہیں۔ وہ تصوّف کے نصب العین کے عین مطابق اس عظیم انسان (مومن) کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے دیوان کبیر (دیوان شمس) میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہاں سست عناصر ، دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

(دیوانِ کبیر)

علامہ اقبالؒ نے اس شعر کو اسرار خودی کی پیشانی پر صفحۂ اول پر نقل کیا ہے۔ اس بات کو مولانا نے مثنویٔ معنوی میں یوں بیان کیا ہے۔

سایۂ یزداں بود ، مردِ خدا
مردہ او زیں عالم و زندہ خدا

گفتۂ او ، گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں کہ مومن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صوفی ،خود شناس اور خود ساز ہوتا ہے۔اس کو قرآن مجید سے نور ہدایت ملتا ہے۔اور اسی کی مدد سے صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے۔اس بات کو انہوں نے مثنوئ معنوی کے دفتر پنجم میں یوں بیان کیا ہے۔

کہ نباید خورد و خو ہمچو خزاں

آہوانہ درختن چو ارنموان

ہر کہ کاہ و جو خورد، قربان شود

ہر کہ نور حق خورد ، قرآں شود

(مثنوی مولانا رومؒ،دفتر پنجم)

مثنوی میں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا فرماتے ہیں کہ جب انسان فقر کو اپنا لیتا ہے تو حضور نبی کریم ﷺ کی مانند ''بے سایہ'' ہو جاتا ہے۔مولانا فنا بحق کو صاحب فقر کے لیے آرائش قرار دیتے ہیں اور شعلہ شمع کی طرح سایہ سے بری بتاتے ہیں۔شمع از سر تا پا شعلہ بن جاتی ہے لیکن سایہ اس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں پاتا۔

''.....مولانا کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا تو اس لیے کہ تم غنا اختیار کر کے حریصوں سے دور رہو۔اس بات کو خزانے اور ویرانے کی تمثیل سے واضح کیا ہے۔کہتے ہیں کہ خزانے کو اس لیے ویرانے میں چھپا کر رکھتے ہیں تا کہ وہ اہلِ آبادی کے حرص اور دستبرد سے مصون و مامون رہے۔''(1)

چوں فناش از فقر پیرایہ شود

او محمدؐ وار بی سایہ شود

فقر و فخری را فنا پیرایہ شود

چوں زبانۂ شمع او بی سایہ شود

شمع شُد جُملہ زبانہ پا وسر
سایہ را نبود بگرد او گذر
معجزۂ پیغمبریؐ بود آں سقا
گشتہ ابر از لطف ہمرنگ سما
گشتہ ریزان قطرہ قطرہ از سما
گفتہ آمد شرح آن در ماجرا
گنج ہا را در خرابی ز آن نہند
تا ز حرصِ اہل عمران وارہند
پرنتانی کند رو خلوت گزین
تا نگردی جملہ خرج آن و این
زانکہ تو ہم لقمۂ ای ہم لقمہ خوار
آکل و ماکولی ای جان ہوشدار

(مثنوی مولانا روم)

سعی وعمل کی فضیلت

حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان سعادت نشان ہے کہ عمل سے بڑھ کر کوئی بھی باوفا ساتھی نہیں ہے۔ اور اگر یہ عمل نیک ہو تو سبحان اللہ، تا ابد ساتھ دے گا۔ لیکن بُرے اعمال قبر میں سانپ کی صورت میں صاحب عمل کو کاٹ کاٹ کھائیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ کسب وعمل کی منزل اُستاد کی رہنمائی کے بغیر کیوں کر طے کی جاسکتی ہے۔ دنیا کے سب سے گھٹیا کام کے لیے بھی اُستاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی صورت پہلے علم کی ہے اور بعد میں عمل آتا ہے جب کہیں ایک مدت کے بعد مقصد ہاتھ لگتا ہے۔ اس کے بعد مختلف، بظاہر گھٹیا، پیشوں (آہنگری، دباغت وغیرہ) کا ذکر کر کے کہا گیا ہے کہ ان سے شان میں فرق نہیں آتا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سعی حصولِ کمال میں جامۂ افتخار واستکبار کو اتار دینا چاہیے، کیونکہ خود کمال، انسان کا بہترین لباس ہے۔

پس پیمبرؐ گفت بہر این طریق
باوفا تر از عمل نبود رفیق

گر بود نیکو ابد یارت بود
ور بود بد در لحد مارت شود
ویں عمل ویں کسب در راہ سداد
کی تواں کرد ای پدر بی اوستاد
دوں ترین کسبی کہ در عالم رود
ہیچ بی ارشاد استادی بود؟
اولش علم است آنگاہی عمل
تا دھد بر بعد مہلت تا اجل

ایک جگہ مولانا نے حضور اکرمؐ کی ایک حدیث کے حوالے سے روز قیامت کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح اس دن ہر جسم کو اُٹھنے کو کہا جائے گا۔ اور صور کا پھونکا جانا حکم خداوندی ہوگا۔ ذرات کے لیے کہ وہ خاک سے اُٹھ کھڑے ہوں۔ جو روح جس بدن میں تھی اسی میں واپس آ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح صبح کے وقت جسم نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ یعنی روح اپنے متعلقہ بدن میں، بالفاظِ دیگر اپنے ویرانے میں خزانے کی مانند در آتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جس جسم سے روح کا تعلق ہوتا ہے اسی میں وہ حلول کرتی ہے، یہ کبھی نہیں ہوا کہ زرگر کی روح درزی کے جسم میں سما جائے۔ اسی طرح عالم کی روح عالم ہی کے بدن میں اور ظالم کی روح ظالم ہی کے بدن میں عود کر آتی ہے۔ اور یہ سب علم الٰہ کے سبب ہے جس نے روح کو اس عمل سے آشنا کیا۔ آگے چل کر مولانا نے مویشیوں کی تمثیل سے اس عمل کی گویا تائید و تثبیت کی ہے۔ پھر صبح کو حشر اصغر قرار دے کر حشر اکبر (قیامت) کا قیاس کرنے کو کہا اور نامۂ اعمال کے داہنے اور بائیں ہاتھ میں تھمائے جانے کا ذکر کیا ہے۔

در حدیث آمد کہ روز رستخیز
امر آید ہر یکی تن را کہ خیز
نفخ صور امر است از یزدان پاک
کہ بر آرید ای ذرائر سر ز خاک
باز آید جان ہر یک در بدن
ہمچو وقت صبح ہوش آید بہ تن

جان من خود را شناسد وقت روز
در خرابۂ خود در آید چوں کنوز
صبح حشر کوچک است ای مستجیر
حشر اکبر را قیاس از وی بگیر
آنچنانکہ جان پرد سوی طین
نامہ پرد ازیسار و از یمین

(مثنوی مولانا روم)

تطہیر قلب:

مولانا جلال الدین رومیؒ اپنی تعلیمات اور پیغام کو آسان پیرایہ میں تمثیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ قدم بقدم قرآن پاک سے رہنمائی لیتے ہیں۔ رومیؒ بار بار تاکید فرماتے ہیں کہ دنیا و دین کے تقاضے بطرز احسن ادا کئے جائیں۔ حسد اخلاق رذیلہ میں سے خطرناک حد تک انسان کو روحانی ضعف دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حسد پر قابو پانا بے حد ضروری ہے کیونکہ انسان تطہیر قلب ہی سے ارفع مقاصد حاصل کر سکتا ہے۔

مثنوی مولانا روم میں حسد کے بارے میں یوں بیان فرماتے ہیں:

عقبہ زیں صعب تر در راہ نیست
اے خنک آنکس حسد ہمراہ نیست
گر جسد خانہ حسد آمد و لیک
آں جسد را پاک کرد اللہ نیک
طہر بیتی بیان پاکی است
گنج نور است او طلسمش خاکی است

(مثنوی مولانا روم، دفتر اول)

حسد اور اس قسم کے رذائل اخلاق پر غالب آ کر رقص روح کی نعمت حاصل ہو سکتی ہے:

جانہا نہ بستہ اندر آب و گل
چوں رہند از آب و گلہا شاد دل

در ہوائے عشقِ حق رقصاں شوند
ہمچو قرص بدر بی نقصان شوند
جسمشاں در رقص و جانہا خود مپرس
و آنک گرد جان از آنہا خود مپرس
(مثنوی مولوی۔دفتر اول)

رومیؒ کا تصوّرِ سماع:

حضرت شیخ سعدیؒ بوستان میں رقص وسماع کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

ندانی کہ شوریدہ حالان مست
چرا برفشانند در رقص دست
کہ شاید درے بر دل از واردات
فشاند سر دست بر کائنات
حلالش بود رقص بر یاد دوست
کہ ہر آستنیش جانے است ز دوست

(بوستانِ سعدی)

مختلف صوفیہ قص وسماع کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں۔لیکن ''مولانا جلال الدین رومیؒ بے اختیار سماع کے قائل تھے۔جو رقصِ روح کا پیش خیمہ ہے۔وہ بجاطور پر فرماتے ہیں کہ سماع رومیؒ رقصِ روح اور بیداری دل کے لیے ہے۔رومیؒ نے حرص وحسد اور غم واندوہ کے خس وخاشاک جلا ڈالنے کی کوشش میں ہماری رہنمائی کی تھی،مگر متاخر رومیؒ دوستوں نے رقصِ بدن کو منتہائے مقصود بنالیا۔

رقص تن از حرف او آموختند
چشم را از رقصِ جان بردوختند
علم و حکم از رقص جاں آید بدست
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم

ملت از وے وارثِ ملک عظیم
رقص جان آموختن کارے بود
غیر حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر
جان برقص اندر نیاید اے پسر

روحانی رقص

جب حضرت شمسؒ نے مولانا رومیؒ کو چھوڑ دیا تو رومیؒ نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ شمس کو ناچنا پسند تھا۔ شمس کے غائب ہونے سے پہلے رومیؒ کے رقص کے بارے میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تاہم جب شمس کی جدائی کے درد سے تنگ آ گیا تو رومیؒ نے سوچا کہ اب شائد وہ واپس نہ آئے۔ لہٰذا ان کی جدائی میں رقص کرتا رہا۔ شمس کا مذاق، تصویر اور صورت رومیؒ کی آنکھوں میں نقش بن گئے۔ شمس کی گمشدگی نے رومیؒ کا دل توڑ دیا اور کافی عرصے تک وہ دیوانگی کا شکار رہا۔ چار پانچ سال تک اس کی یہی حالت رہی۔ اور اسی دوران رومیؒ نے روحانی رقص شروع کیا۔ یہ وہ رقص تھا جس کے ساتھ آسمان اور کائنات بھی رقص کرتے رہے۔ اس رقص میں رومیؒ شمس کے گرد گھومتا رہا اور ذرات سورج کے گرد گھومتے رہے۔

رومیؒ رات دن وجد کی حالت میں رقص کرتے رہے۔ وہ زمین پر آسمان کی طرح گھومتا رہا۔ اس کی آواز آسمانوں تک پہنچ گئی اور آس پاس کے تمام لوگوں نے سُن لی۔ فنکاروں پر انہوں نے سونا اور چاندی نچھاور کر دیا، سب کچھ بول دیا اور لمحہ موسیقی سُنتا رہا۔ لوگ اس کے دیوانہ پن پر حیران تھے۔ اور سوچتے رہے کہ وہ کتب اور مفتی یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے۔ لیکن وہ لوگ بعد میں ان کو پڑھ کر خود بھی محبت میں پاگل ہو گئے اور خدا کے الفاظ کا ورد کرتے ہوئے بانسری بجانے والوں میں گھل مل جاتے۔ شمس رومیؒ کے پاس رقص اور موسیقی کی شکل میں واپس آ گیا۔ اس نے اپنے اندر وہ وجد دریافت کیا تھا جو شمس نے ان کے اندر روحانی موسیقی کے ذریعے دریافت کیا تھا۔ شمس کی گمشدگی میں رومیؒ نے جس چیز کا مظاہرہ کیا، وہ انسانی محبت تھی۔

مولانا رومیؒ کے تین حوالے سماع کے بارے میں سامنے آتے ہیں:

اے چمکتے ہوئے سورج اب نکلو بھی

ذرات رقص کر رہے ہیں

روح نشے کی حالت میں رقص کر رہی ہے

آ جاؤ میں تمہارے کان میں سرگوشی کروں گا

ہر ذرّہ خوش یا پریشان ہے

محبت کر رہا ہے اس سورج کے ساتھ

جس کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا

اے آسمان ہمارے سروں کے اوپر رقص کرو

سورج کی محبت کے لیے تم وہ کام کر رہے ہو جو میں کر رہا ہوں

اپنی محبت کے لیے رقص کرو، سورج کی محبت کے لیے رقص کرو

چشمے سے نکلنے والا پانی مجھے نظر آ رہا ہے

مجھے نظر آ رہا ہے کہ درخت کی شاخ رقص کر رہی ہے

ان کے پتے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اکٹھے رقص کر رہے ہیں۔(2)

درویش طریقت کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں آئے ہوئے لوگ سفید کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جن کے کندھوں پر کالا لبادہ ہوتا ہے۔ ان کے سر پر پگڑی ہوتی ہے۔ وہ خواہشات کی موت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ شیخ سب سے آخر میں داخل ہو جاتا ہے رومیؒ کی نمائندگی کی شکل میں۔

سب سے پہلے رقاص داخل ہو جاتے ہیں اور بعد میں شیخ آ جاتا ہے۔ شیخ سب کچھ کا خفیہ مرکز ہوتا ہے اور ابدی رومیؒ کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترغیبات اور پیغام رقص کے مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی اونچی پگڑی کے اوپر کالا رومال اس کی حیثیت اور عزت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو درویش انہیں سلام کرتا ہے وہ بھی ان کو سلام کا جواب دیتا ہے۔ وہ سُرخ قالین کے سامنے بیٹھا ہے۔ جس کا رنگ سورج کے رنگ کے برابر ہوتا ہے جو قونیہ کے آسمان پر پھیل جاتا ہے اس تقریب میں سب کچھ انتہائی اہم اور باعظمت ہوتا ہے۔ اس کے بعد ساز گر پیغمبرؐ کی تعریف میں نعت گاتا ہے۔ اور بانسری بجانے والا بانسری بجاتا ہے۔ اس کے بعد درویش فرش پر رقص کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس رقص سے ہمیں رقص کے تین مراحل کا پتہ چل جاتا ہے۔ آخری مرحلے پر شیخ قالین پر بیٹھ جاتے ہیں اور درویش دوسری طرف بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد ماہرین موسیقی گانا گاتے ہیں اور رقاص کالا لبادہ پہن کر میدان میں اُتر آتا

ہے۔شیخ اُٹھ جاتا ہے اور درویش ان کی طرف بڑھتا ہے اور ان کا دایاں ہاتھ چُومتا ہے۔اور شیخ درویشوں کو وجد کرنے کی اجازت دیتا ہے اور درویش ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اونچے کر کے خدا کی رحمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔اتحاد ویگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس وجد میں کائنات کا قانون نظر آتا ہے۔ مثلاً سورج کے گرد سیّارے گھومتے ہیں۔اور ڈھول روزِ قیامت آنے کی علامت ہے۔آخر میں ایک بار پھر بانسری بجائی جاتی ہے۔یہ لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے اور خدا کے ساتھ اتحاد کی علامت ہوتا ہے۔جب بانسری کی آواز رک جاتی ہے اور ماہرینِ فن قرآن کے الفاظ سُناتے ہیں۔اور آخر میں خدا کے الفاظ ان کے تمام سوالوں کا جواب فراہم کرتا ہے۔اس کے بعد ذکر کا آغاز کیا جاتا ہے۔خدا کے مقدس نام کا ذکر کیا جاتا ہے۔آخر میں مکمل خاموشی جس سے یہ رقص وسرور نکلا ہے۔

سماع کیا ہے؟ ان کا پیغام ہے جو دل کے خفیہ خانوں میں رہتے ہیں وہ پیغام ہے جو دل کو سکون دیتا ہے۔ سماع وہ ہوا ہے جو علم اور عقل کی شاخوں کو گم کر دیتی ہے وہ آواز ہے جو وجود کے باریک سوراخ سے گزرتی ہے۔

ایک روحانی آواز ہے جو صبح کے لیے چیختی ہے۔

یہ ایک ڈھول ہے جو فتح کی نوید سناتا ہے۔

روح کی شراب ہے جو جسم کو گرمائش پہنچاتا ہے۔

اور جب جسم طنبورہ سنتا ہے تو تبدیلی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

جسم کے اندر سے ایک پُرنور آگ نکل آتی ہے۔

یہ آگ اس بانسری کی آگ ہے جو بجانے والے کے لب کو مٹھاس دیتی ہے۔

اور ایک پیالے کے بغیر وجد کے ہزاروں اوقات کیسے گزرتے ہیں۔

درد دل کے ہزاروں بچھو دیکھو کیسے مرتے ہیں۔

مولانا رومیؒ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

اس وقت وجد کرو جب تم پاک ہو۔

اولیائے کرام روحانیت کے میدان میں وجد کرتے ہیں۔جب وہ وجد کرتے ہیں تو وہ خود غرضی اور شخصی خواہشات سے ہٹ کر اتحاد ویگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔تم اس وقت تک وجد نہیں کر سکتے جب تک اپنے خون کے اندر وجد پیدا نہ کرو۔وجد کرو تم اپنے آپ کو توڑ سکتے ہو۔

اورخواہشات کے زخم سے پردہ اُٹھاؤ

عام لوگ گلیوں کوچوں میں ناچتے ہیں

جبکہ صوفی اپنے خون کے اندر ناچتے ہیں۔

ہر کجا دردے دوا آنجا رود

ہر کجا فقرے نوا آنجا رود

ہرکجا پستی ست آب آنجا رود

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

پاک کن دو چشم را از خوئے عیب

تابہ بینی باغ و سرو سروستانِ غیب

محبت کی تلقین

مولانا روم کے بقول محبت روح کو بلوغت اور انسان کو روحانی سکون سے ہم کنار کرتی ہے۔ محبت انسان کو خدائے بزرگوار کا قرب بخشتی ہے اور وہ تمام انسانوں سے رنگ، زبان اور مذہب کئے بغیر محبت کی تلقین کرتے ہیں۔

مولانا رومؒ کے بقول قلبی یگانگت لسانی اتحاد سے بالاتر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''میں پُرکار کی مانند اپنے ایک پاؤں کو اسلامی قانون کے اوپر مضبوطی سے رکھ کر دوسرے پاؤں سے بہتر فرقوں اور قوموں پر گھومتا ہوں۔'' اور اُن کے یہ الفاظ دوسرے مذاہب اور فرقوں کے لیے حُسنِ ظن کا مظہر ہیں۔ مولانا نے بہت پہلے ہی سے جان لیا تھا کہ موسیقی انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے مولانا کا فلسفہ اور موسیقی لازم وملزوم ہیں۔ مولانا روم کی محافل ومجالس کے ناگزیر آلاتِ موسیقی رباب اور بانسری ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ ''رباب کی زبان چاہے ترکی ہو، یونانی ہو یا چاہے عربی ہو یہ محبت کرنے والوں کی زبان ہے۔''

انہی کے بقول:

''گو بانسری ساز کی آواز دینے والی ایک چھڑی کی مانند ہے لیکن یہ اُستاد کے ہاتھ میں

الہامی رموز کو بیان کرنے والی آواز ہے۔''

مولانا رومؒ کے فلسفے میں رقص کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اُن کے حلقے میں حقیقت کے متلاشی درویش رباب اور بانسری کی آواز پُر جوش میں آ کر گھوم گھوم کر رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سماع نامی یہ رقص ایک شکل عبادت کی ہے۔ سماع میں شامل ہونے والے درویش اک مخصوص لباس پہنتے ہیں۔ سر پر لمبا کلاہ کتبہ قبر، کندھے پر موجود جیکٹ قبر کو اور کھلا سفید جبہ کفن کو ظاہر کرتا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی مانند سورج کے گرد گھومنے کے منظر کو پیش کرنے والے درویش رقاص بعض وقات اپنی جگہوں سے ہٹتے رہتے ہیں۔ ان کے بازو دونوں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ داہنے ہاتھ اوپر اور بائیں ہاتھ نیچے کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ہم خدا تعالیٰ سے لے کر انسانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور اپنے لیے کچھ نہیں بچاتے۔

سماع میں خدا تک رسائی مقصود ہوتی ہے۔

مولانا کے بقول:

''موت کا دن اللہ تعالیٰ تک رسائی کا دن ہونے کی وجہ سے خوشی کا دن ہے شبِ آرزو ہی شب وصال ہے۔''

رومیؒ ایک بردبار اور غم فراموش صوفی تھے۔ شمس الدین افلاکی (م760ھ) کی مناقب العارفین کو دیکھیں کہ رومیؒ اپنی برملا بُرائی سُن کر کسی قدر مسکرا دیتے تھے۔ وہ ایک ذکی الحس اور سراپا حرکت وحرارت شخصیت تھے۔ کبھی کبھی نماز کی ایک رکعت میں ان کی پوری رات گزر جاتی تھی۔ اس لیے وجد وسماع ان پر طاری ہو جانا ایک بدیہی امر تھا۔ اس کے باوجود ان کا معمول صحو تھا اور سُکر ومحویت سے وہ گریزاں تھے۔ وہ فتوے لکھ کر کسبِ معاش کرتے اور بے عمل صوفیاء کے خلاف تھے۔

دوست دارد بارِ ایں آشفتگی
کوشش بیہدہ بہ از خفتگی
اندریں راہ می تراش و می تراش
تادمِ آخر دمے فارغ مباش

فقرِ اختیاری

مولانا جلال الدین رومیؒ فقرِ اختیاری کے حامی تھے۔ اُن کی نظر میں دولت کا ہونا بُرا نہ تھا کیونکہ دولت کی مدد سے دین کے کارہائے خیر کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ یہ ایک نکتہ ہے کہ دل میں دولت کی محبت جاگزیں نہ ہو۔ کیونکہ اس سے دل کی اسیری اور موت واقع ہو جاتی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
مال را گر بہر دین باشی حمول
نِعمَ مالٌ صالح گوید رسولؐ

.....

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است
چونکہ مال و ملک را از دل براند
زاں سلیماں خویش جُز مسکیں نخواند
بادِ درویشی چوں در باطن بود
بر سرِ آبِ جہاں ساکن بود
جہد حق است و دوا حق ست و درد
منکر اندر نفیِ جہدش جہد کرد (3)

ڈاکٹر محمد ریاض رومی کے تصورِ فقر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کا مقصد یہ تھا کہ دولت سے استغنا اور بے نیازی برتی جائے۔ اسے اپنی جائز احتیاجات اور دینی تقاضے پورے کرنے کے کام میں صرف کیا جائے۔ مگر اس کے حصول کو معراجِ حیات نہ جانا جائے۔ حدیثِ قدسی ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِی وَبِہ اَفْتَخِر۔ اس کے حوالے سے رومیؒ ایک زن و شوہر کی حکایت میں (دفتر اوّل) فرماتے ہیں کہ حقیقی فقیر کی شان بے نیازی کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔'' (4)

گفت اے زن تو زنی یا بوالحزن
فقر فخر آمد، مرا بر سر مزن
کار درویشی ورائے فہم تُست
سوی درویشاں منگر سُست سُست
زانکہ درویشی ورائے کارہاست
دمبدم از حق مرا ایشاں را اعطا ست
بلکہ درویشان ورائے ملک و مال
روزیٔ دارند ژرف از ذوالجلال
حق تعالیٰ عادل ست و عادلاں
کے کنند استمگری بر بے دلاں
آں یکے را نعمت و کالا دہند؟
ویں دگر را بر سرِ آتش نہند؟
فقرُ فخری نز گزاف ست و مجاز
صد ہزاراں غر پنہاں ست و ناز (5)

لازمۂ فقر

مولانا روم ہمیں ترکِ دنیا کا درس نہیں دیتے۔ مولانا جہاد اور قتال کو لازمۂ فقر سمجھتے ہیں وہ عزلت اور گوشہ نشینی کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کا فقر تو جہاد اور مقاومت کا نام اسی تعلیم کی اشاعت کے لیے یوں بیان فرماتے ہیں:

ایں جہاں جنگ است کُل چوں بنگری
ذرہ با ذرہ چوں دیں با کافری
تیغ جانہار کند پاک از عیوب
زانکہ سیف افتاد محاء الذنوب

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

(مثنوی مولانا رومؒ)

مولانا روم ہمیں جہد مسلسل کا درس دیتے ہیں۔ وہ ایسے صوفیوں پر بھرپور تنقید کرتے ہیں۔ جو بے عملی کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ ہمیں سعی وکوشش سے بے نیازی نہ برتنے کی بھرپور تلقین کرتے ہیں:

آنکہ او شاہ است او بیکار نیست
نالہ از وے طرفہ کو بیمار نیست
بہر ایں فرمود رحمٰن اے پسر
کل یوم ھو فی شان اے پسر

(مثنوی مولانا روم)

مولانا روم فرماتے ہیں کہ توکّل کا مطلب ہرگز بے یقینی، بے عملی یا مجبوری نہیں۔ اس کا مطلب ہمیں از بر ہونا چاہیے کہ توکّل کے مطابق اپنا کام پوری توجہ، محنت اور لگن کیا جائے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ توکّل کے بارے میں ہمیں یوں نصیحت فرماتے ہیں:

گر شُتر باں اُشترے رامی زند
خشم اُشتر نیست باآن چوب او
پس ز مختاری شتر بردہ است بُو
عقل حیوانی چو دانست اختیار
ایں بگو اے عقل انسان شرم دار
ایں کہ فردا آں کنم یا ایں کنم
ایں دلیل اختیار است اے صنم
و آں پشیمانی کہ خوردی از بدی
ز اختیار خویش گردی مہندی
جملہ عالم مقر در اختیار

امر و نہی ایں بیار و آں میار
سعی ابرار و جہاد مومناں
یا بدیں ساعت ز آغاز جہاں
حق تعالیٰ جہد شاں را راست کرد
آنچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
گر توکّل می کنی ، درکار کُن
کار کُن پس تکیہ بر جبّار کُن
گفت پیغمبرؐ باآواز بلند
بر توکّل زانوئے اُشتر بپند
رمز الکاسبُ حبیب اللہ شنو
از توکّل در سبب کاہل مشو
در توکّل کسب و جہد اولیٰ تراست
تا حبیب حق شوی ایں بہتر است
سعیِ شکر نعمتِ قدرت بود
جبر تو انکارِ آں نعمت بود
شکرِ نعمت نعمت افزوں کند
کفرِ نعمت از کفت بیروں کند

.....

جُز توکّل جُز کہ تسلیم تمام
در غم و راحت ہمہ مکر ست و دام

(مثنوی مولانا رومؒ، دفتر اول، ص:210)

موت سے بے خوفی

محترم ڈاکٹر محمد ریاض صاحب رومیؒ کے تصورِ فقر کے بارے میں یوں اظہار فرماتے ہیں:

''اس دنیا میں انسان کے بڑے امتحانات جان اور مال کی قربانی سے مربوط ہیں۔ مال کی قربانی زکوٰۃ، صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے دوسرے طریقے ہیں جب کہ جان کی آزمائش جہاد و قتال کے معرکے میں مال کی محبت انسان کو بخیل اور ممسک بنا دیتی ہے اور جان کے بچاؤ میں وہ موت کی ہر صورت سے خائف رہنے لگتا ہے۔ حقیقی صوفیہ ان دونوں فتنوں سے مصون رہے اور متاعِ دل کو سالم لے جا سکے ہیں۔ رومیؒ کا فقر ان فتنوں سے ہمیں برحذر رکھتا ہے۔۔۔ مگر موت سے بے خوفی کے سلسلے میں ان کے بیانات اور بھی ایمان افروز ہیں وہ موت کو ارتقائے حیات کا ایک مرحلہ بتاتے ہیں۔۔۔ رومیؒ کی نظر میں انسان کا منتہائے مقصود دیدارِ ذات ہے جسے وہ مقامِ کبریا سے تعبیر کرتے ہیں۔''(6)

خود زفلک بر تریم وز ملک افزوں تریم
زیں دو چہ نگزریم ، منزل ما کبریا ست

اے خوشا کو عاشقے باللہ شد
پاک باز و عارفے باللہ شد

اے خدائے پاک رب دو جہاں
من کجا یابم ترا اندر جہاں

دل ہمی خواہد کہ زیں عالم روم
جسم بگزارم سوئے جاناں روم

آں دلے کز عشقِ حق بیمار شد
زیں حیاتِ عارضی بے زار شد

بے تو ایں خوش رنگی کون و مکاں
خوش نمی آید بجان عاشقاں

ہر کہ با سلطان جان عارف نشد
از بہائم شد بتر واقف نشد
عاشقے کو سُوئے جاناں می رود
گر دو صد زنجیر بیند بر درد

انہوں نے مال کی بے مائیگی کی طرح موت کو بھی ایک معمولی اور نا قابلِ ترس کام قرار دیا ہے۔ رومیؒ کی زندگی کا ایک اندوہناک واقعہ ان کے مرشد شمس الدین تبریزی کا غائب ہونا تھا۔ مگر سلامتی قلب کی خاطر انہوں نے اس قلق کو جلد بھلا دیا۔ مولانائے روم کے احباب میں صلاح الدین زرکوب (م 657ھ) اور حسام الدین چلپی (م 683ھ) کے نام معروف ہیں۔ رومی کی بے خوفی موت کا یہ منظر قابل دید رہی ہوگی۔ صاحبِ مناقب العارفین کے بقول صلاح الدین زرکوب کے جنازے کی مشائعت میں وہ اپنے اس دوست کی وصیّت کے مطابق سماع کرتے رہے۔ ان کے مریدوں نے بھی یہی روش اپنائے رکھی۔ اور رومیؒ کو بھی سماع اور رقص کے اہتمام کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ بہر حال رومیؒ جہاد و قتال کے لیے سر بکف رہنے کے لیے اور روحانی ارتقا پر توجہ دلانے کی خاطر موت سے بے خوفی کا درس مدت العمر دلاتے رہے۔ اور ان کے نظامِ فقر میں اس تعلیم کی ایک خاص اہمیت ہے۔

زندگی در مردن و در محنت است
آب حیواں در درون ظلمت است
نہ چناں مرگی کہ در گوری روی
مرگ تبدیلی کہ در زوری روی
می رود چوں زندگی بر خاکداں
مردہ و جانش شدہ بر آسماں

.....

شیر دنیا جوید اشکاری و برگ
شیر مولا جوید آزادی و مرگ
از ملائک بایدم روختن جلو
کل شی ھالک الا وجھہ

دل کی اہمیت

مولانا روم کے تصور فقر و تصوّف میں دل کی بے حد اہمیت ہے اور اس کے اشراق سے صوفیاء وجود انسانی کو منور کرتے رہے ہیں۔ رومیؒ کے صد ہا بیت اہمیت دل کے بیان کے لیے وقف رہے ہیں۔ وہ بار بار یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ دل عرفاء اور ہے اور سینے کے اندر دھڑکنے والا یہ معمولی دل اور:

گو اہل دل نہ ای بیدار باش
طالبِ دل باش و درہیکار باش
تو ہمی گوئی ترا دل نیز ہست
دل فراز عرش باشد نے بہ پست
تو گلِ خود را دلی پنداشتی
جستجوئے اہلِ دل بگذاشتی

رزقِ حلال

مولانا رومی کے نزدیک دل کی بیداری اور سوز، حلال روزی سے ہاتھ لگتے ہیں۔ اکثر صوفیاء نے حلال روزی کے حصول و کسب پر بے حد زور دیا ہے۔ مگر رومیؒ کی تلقین اور بھی شدید تر ہے۔ وہ یہ نکتہ یاد دلاتے ہیں کہ حقیقی عشق و مستی، رقت و حال اکلِ حلال سے حاصل ہوتے ہیں۔

لقمہ کان نور افزود کمال
آں بود آوردہ از کسبِ کمال
علم و حکمت زائد از نانِ حلال
عشق و رقّت آید از نانِ حلال
ہیچ گندم کاری و جو بر دہد؟
دیدہ استی کہ کرہ خر دہد؟
لقمہ تلخ است و برش اندیشہ ہا
لقمہ بحر و گوہرش اندیشہ ہا

زاید از لقمہ حلال اندر دہان
میلِ خدمت، عزمِ رختن آں جہاں

(مثنوی مولانا روم۔دفتر اول)

سوال اور گدائی سے امتناع

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں کہ عشق و مستی اللہ سے طلب کرو، اور اللہ تعالیٰ سے قلبی دعا مانگو کہ وہ تمہیں رزقِ حلال سے سرفراز فرمائے۔ اور دوسروں کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ سوال اور گدائی سے غیر اللہ کا احسان مند ہونا پڑتا ہے۔ اور حقیقی فقر کو بے حد ضرر ہوتا ہے۔ اور فقر کو ضعف ملتا ہے۔

پس گدایاں آئینہ جود حق اند
و آنک با حق اند، جود مطلق اند
وآنک جزایں دوست او خود مردہ ایست
او بریں در نیست، نقش پردہ ایست

.....

نقش درویشت او نہ فقرِ حق
پیش نقش مردۂ کم نہ طبق
ماہی خاکی بود درویش نان
شکل ماہی لیک از دریا رمان
مُرغ خانہ ست اور نہ سیمرغ ہوا
لوت نوشد او ، ننوشد از خدا
عاشق حقست او بہر نوال
نیست جانش عاشق حسن وجمال
گُل مخور ، گُل وا مخر، گُل را مجوی
زانکہ گُل خوار است دائم زرد روی

رزق از حق جو مجوی از زید و عمر
مستی از حق جو، مجو از بنگ و خمر
دل بجو تا جاوداں باشی جواں
از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ برگردن برند
از طمع ہر گز نخوانم من فسوں
ایں طمع را کردہ ام من سرنگوں
حاشِ للّٰہ طمع من از خلق نیست
از قناعت در دلِ من عالمی است

(مثنوی مولانا رومؒ)

حقیقی فقر انسان کو اللہ تعالیٰ سے نیاز مندی اور مخلوق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور فقیر صاحب ثروت و اقتدار سے دوری پسند کرتا ہے۔ حقیقی فقر متوجہ الی اللہ رہتا ہے۔ اور باقی سفلی امور اس کے لیے ضمنی ہوتے ہیں''۔ حقیقی فقر میں استغنا اور جرأت مردانہ کا فقدان نہیں ہوتا۔ حقیقی فقر کا نصب العین اور درویشی کا معیار قابلِ رشک ہوتا ہے:

دفتر صوفی سواد و حرف نیست
جز دل اسپید مثل برف نیست
زادِ دانشمند آثار قلم
زادِ صوفی چیست ! آثار قدم
ہمچو صیادی سوی اشکار شد
گامِ آہو دید و بر آثار شد
چند گامش گام آہو درخور است
بعد ازاں خود نافِ آہو رہبر است

راہ رفتن یک نفر بربوی ناف
خوشتر از صد منزل گام و طواف
صوفیاں صافیاں چوں نور خور
مدنی افتادہ برخاک قذر
بی اثر پاک از قذر باز آمدند
ہمچو نور خور سوی قصر بلند

(مثنوی مولانا رومؒ)

حقیقی فقرا اپنے درویش کو مخلوق کی طرف سے احسان مند نہیں ہونے دیتا۔ ''رومی کے نزدیک حقیقت فقر اور صوفیاء وہ ہیں جنہیں اصطلاحاً ''ابن الوقت یا ابوالوقت کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جو زمان و مکان پر غالب ہیں۔ ان کے روحانی مکاشفات اور وکرامات کے سامنے مکانی بُعد اور زمانی مدتیں مزاحم نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ اخلاق اللہ اور اتباع رسولؐ کی لایزال نعمتوں سے بہرہ مند ہو چکے ہیں۔

صوفی ابن الوقت باشد ای رفیق
نیست فردا گفتن از شرطِ طریق
ہست صوفی صفا چوں ابن وقت
وقت را ہمچو پدر بگرفتہ سخت (مثنوی مولانا رومؒ)

صوفی کی پہچان

صوفی وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو غیر اللہ سے محفوظ رکھے دل میں کوئی شیطانی خطرہ نہ آنے دے۔ عبادت اور ریاضت میں اصولِ شرع اور سُنتِ رسولؐ پر قائم رہے۔۔۔ ابن الوقت وہ صوفی کہلاتا ہے جو اسرار اور واردات سے مغلوب الحال ہو جائے۔ اسرار کا اظہار کر دے۔ خوارق اس سے ظاہر ہو جائیں اور احکام ظاہری کی مخالفت کر بیٹھے۔ ابن الوقت ہی کو قلندر اور رند بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ابن الوقت اس صوفی کو بھی کہا جاتا ہے جو مقتضائے وقت پر عمل کرے۔ یہ معنی پہلے سے عام ہیں جو اصطلاحی ابن الوقت اور ابوالوقت دونوں کو شامل ہیں۔

''ابوالوقت وہ صاحبِ مقام صوفی کہلاتا ہے جو آدابِ شریعت کا پورا پاس کرے۔ حالات اور واردات میں نفس اور روح پر قابو رکھے۔ خداوندی حکمت کے مقتضٰی کو سمجھتے ہوئے

کرامات اور خوارق پر قابو رکھے۔ ابوالوقت کا مقام ابن الوقت سے بہت اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔''(8)

مولانا جلال الدین رومیؒ بظاہر وحدت الوجود کے حامی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ فیہ مافیہہ میں کچھ بیانات سے یہ تاثر ملتا ہے مگران کی دیگر شعری تصانیف میں ایسانہیں۔ مولانا رومیؒ کے تصورِ فقر میں خودی اور خودشناسی کی بے حد اہمیت ہے۔ اس کا تذکرہ انہوں نے بار بار کیا ہے۔

تونمی دانی آخر کیستی
جہد کن چندانکہ دانی چیستی
چونکہ بر بوک است جملہ کارہا
کاربن اولیٰ کزاں گردی رہا
جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر ، واللہ اعلم بالصواب

(مثنوی مولانا روم)

فقر رومیؒ دین و دنیا کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ اس میں شریعتِ اسلام طریقت صوفیاء پر مقدم ہے۔ رومیؒ شرع اسلام کے پابند تھے اور اس کی پابندی کے داعی بھی۔۔۔ وہ ہمیشہ بندگیٔ خدا اور عبادت شعاری کا درس دیتے رہے۔ انہوں نے غیراللہ کے آگے سرتسلیم کرنے (سربزیری) کو مکروہ بتایا ہے۔

آدمی را ہست در ہر کار دست
نیک ازو مقصود ایں خدمت بداست
ماخلقت الانس والجن ایں بخواں
جز عبادت نیست مقصود از جہاں
از خدا غیر خدا را خواستن
ظن افزوں نیست کلی کا سستن

رومی شاعر محبت تھے۔ جن کی تلقینات آج بھی عالم انسانیت کے لیے مشعل راہ ہوسکتی ہیں۔۔۔ رومیؒ کا تصوّرِ فقر کس قدر اعلیٰ وارفع اور پاکیزہ رہا ہے۔ یہ سربلندی، قدرت اور قوت وشکوہ کا مظہر ہے۔۔۔ ان کے فقر وتصوّف اور نقطۂ نظر میں رواداری اور عالمگیریت پنہاں ہے۔

از محبت تلخ ہا شیریں شود
از محبت مسہا، زریں شود
از محبت دردہا ، صافی شود
وز محبت دردہا شافی شود
از محبت سجن، گلشن می شود
وز محبت بار ، بختی می شود
از محبت سنگ، روغن می شود
بی محبت، موم آھن می شود
از محبت نیش، نوشی می شود
بی محبت شیر ، موشی می شود
درنگنجد عشق در گفت و شنید
عشق دریائی است، قعرش ناپدید
قطرہ ہای بحر را نتواں شمرد
ہفت دریا پیشِ آں بحر است خورد

مولانا روم نے فقر وتصوّف کے بارے میں اپنے حرکی اور فعالیت آمیز تصورات پیش کئے ہیں۔انہوں نے توکّل ،تقدیر اور مختلف صوفیانہ معمولات کے بارے میں اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر منتقل کئے۔انہوں نے عظمت و احترام آدم کا قرآنی سبق پھر یاد دلایا۔فرمایا کہ انسان جس طرح ہر مرحلۂ زندگی میں ارتقاء پزیر رہا،موت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا،لہذا موت سے خوف کیسا۔

فقر رومیؒ عشق ومستی کا آمیزہ ہے۔اس میں وجد وحال ہے۔موت سے بے خوفی اور جہاد وقتال کی آرزو بار بار ملتی ہے۔

بمیرید ، بمیرید دریں عشق بمیرید
دریں عشق چو مردید، ہمہ روح پذیرید

بمیرید ، بمیرید ازیں مرگ مترسید
کزیں خاک بر آئید ، سموات بگیرید
بمیرید بمیرید وزیں ابر بر آئید
چو زیں ابر بر آئید ہمہ بدر مزید

(دیوان کبیر)

.....

برمکن آں بر کہ نپزیرد رفو
رومیؒ مخراش از غزا ای خوب روی
زخم ناخن بر چناں رُخ کافریست
کہ رخ مہ در فراق او گریست

ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کے قائل مست الست صوفیوں کا یہ لب ولہجہ نہیں ہوسکتا تھا۔

رومیؒ اور تجلی عشق

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی رومی کے اشعار میں تجلی عشق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''عارفوں کا عقیدہ ہے کہ انسانی وجود کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس سے یہ قوت لے لی جائے تو زندگی بے وقعت ہو کر رہ جائے گی۔ تو اس لحاظ سے تصوّف ، مذہب عشق ہے، مسلک محبت ہے اور ایک ایسا طریقہ ہے جو زندگی کے بار سنگیں کو عشق کی قوت وطاقت سے ہلکا کر دیتا ہے۔ دکھ تکلیف اور بیماریاں اس قوت کی مدد سے درمان پذیر ہوتی ہیں۔۔۔ عشق کے طفیل تلخیاں، شیرینی میں، تانبا سونے میں، کانٹے پھول میں اور سرکہ شراب میں بدل جاتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے خدا خود، انسان کے دل میں ڈالتا ہے۔''(9)

خدا ایک مخفی خزانہ تھا۔ ''(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا) میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، اس لیے میں نے انسان کو پیدا کیا تا کہ وہ مجھے پہچانے۔ فرشتے خلقتِ عشق کے لائق نہ ٹھہرے چنانچہ اس فال کا قرعہ انسان کے نام پڑا۔

در ازل پرتو حسنت ز تجلی دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد

اس بات کو خواجہ حافظ شیرازی نے یوں بیان کیا ہے:

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

رومی کے نزدیک عشق مجازی (مجاز، حقیقت کا پُل ہے) کے مصداق عشق حقیقی کی گزرگاہ ہے۔ رومی عقل کو عشق کے مقابلے میں کمتر قرار دیتے ہیں۔

درنگنجد عشق در گفت و شنید
عشق دریائیست قعرش ناپدید

.....

عشق وصفِ ایزدست امّا کہ خوف
وصفِ بندہ مبتلاء فرج و جوف

.....

شرح عشق ارمن بگویم بردوام
صد قیامت بگزرد واں ناتمام

.....

ہرچہ گویم عشق را شرح و بیاں
چوں بہ عشق آیم خجل باشم ازاں

.....

چوں قلم اندر نوشتن می شتافت
چوں بہ عشق آمد قلم بر خود شگافت

رومیؒ کا عقیدہ ہے کہ عقل، علم و ادب سیکھنے میں لگی ہے، جب کہ عشق افلاک کی طرف پرواز کناں ہے۔ دونوں (عشق و عقل) کو خطاب کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

ای عقل تو بہ باش، در دانش و در بینش
یا آنکہ بہر لحظہ، صد عقل و نظر سازد

.....

عشق است بر آسماں پریدن
صد پردہ بہر نفس دریدن

.....

عشق شیرینی جانست و ہمہ چاشتی است
چاشنی و مزہ را صورت و رنگے نبود

پروفیسر لطیف اللہ کے بقول:

''مولانا رومیؒ کے تخلیقی تخیل نے عشق کو ''مصحف'' سے تشبیہہ دے کر نیا مضمون پیدا کیا ہے۔جس کی مثال فارسی شاعری میں کم یاب ہی نہیں نایاب ہے۔''(10)

مصحفِ عشق ترا دوش بخواندم بخواب
آہ کہ دیوانہ شُد ، جانِ من از سورہ (۲۰)

مولاناؒ کے نزدیک اگر عشق کی مدح ہزار زبانوں (بولیوں) میں کی جائے تب بھی عشق کی مدح کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

بصد ہزار لغت گر مدیحِ عشق کنم
فزوں ترست جمالش ز جملہ دبہا

مولانا رومیؒ نے دیوانِ شمس تبریزؒ میں ایک مکالمہ تحریر کیا ہے جو ایک رات اُن کے اور عشق کے درمیان ہوا۔اس مکالمے میں حیات، عمر، آتشِ دل، دیدۂ تر، رنگریز، اسپ لاغر، گُل لالہ، لذّتِ نالہ، قیمت جنس، کاشفِ اسرارِ عشق کی تشبیہات شامل ہیں۔

گفتم عشق را شبے راست بگو تو کیستی
گفت حیاتِ باقیم عمرِ خوش مکرّرم
گفتمش اے بروں زجا خانۂ تو کجاست گفت
ہمرہ آتشِ دلم ، پہلو دیدۂ ترم
رنگرزم ز من بود، ہر رُخے زعفرانیئے
چیست اُلاقم و ولے عاشقِ اسپِ لاغرم

غازۂ لالہا منم، قیمت کالہا منم
لذتِ نالہا منم ، کاشف ہرمسترم

(دیوان شمس تبریز)

.....

عشق شیرنی جانست و ہمہ چاشنی است
چاشنی و مزہ را صورت و رنگے نبود
صورت ہردو جہاں جملہ ز آئینۂ عشق
بنماید چو کہ بر آئینہ زنگے نبود
عشق است بر آسمان پریدن
صد پردہ بہر نفس دریدن

.....

عشق شاخیست ز دریا کہ در آید در دل
جائے دریا و گہر سینۂ تنگے دارد

صوفیہ کے نزدیک حق تعالیٰ سے محبت کا بنیادی تقاضا، تفویض اور سپردگی ہے۔ اس وسیلے سے انہیں بارگاہِ الٰہی سے ایسے انعام اور اکرام ارزانی ہوتے ہیں جو انسان کے حیطۂ خیال میں نہیں آ سکتے۔ ذیل میں نقل کردہ شعر نہ صرف ندرتِ خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ جہانِ عشق کا ایک نئی جہت کی نشاندھی بھی کرتا ہے۔

عشق قہار ست و من مقہور عشق
چوں شکر شیریں شدم از شورِ عشق

عشق ایسی قوت وتوانائی ہے جس کے سامنے زمین وآسمان اور کوہ وبحر، عاجز ودرماندہ ہیں۔ عشق جس طرح چاہے انہیں تصوّف میں لاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ خالقِ کائنات کی صفاتِ کمالیہ کا مظہر ہے:

عشق جو شد بحر را مانند دیگ
عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف

(مثنوی مولوی مثنوی)

عشق ہی سرچشمۂ صداقت ہے۔ اگر عشق موجود ہے تو دین کی حقیقت موجود ہے۔ اور اگر عشق نہیں تو دین محض تقلید و روایت ہے جس سے انسان کے باطن کو کچھ فیض نہیں پہنچتا۔

علامہ اقبالؒ کا تصورِ فقر:

فقر کے لغوی معنی افلاس اور ناداری کے ہیں لیکن تصوّف کی اصطلاح میں توکّل اور قناعت کو فقر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق فقر کو ناداری کے معنوں میں نہیں بلکہ قناعت اور توکّل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو افلاس کے باعث انسان کو بھوک اور ننگ کا شکار بناتا ہے۔ اسلام اس کے خلاف جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ اور فقر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان دنیاوی دولت حاصل ہونے کے باوجود اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ اسے اپنی زندگی پر مسلط نہیں کرتا اور اس ہوس کو دل میں جاگزیں نہیں ہونے دیتا۔ یہی فقر ہے جو روح کو بالیدگی اور ذہن کو توانائی عطا کرتا ہے۔ اسی فقر کے متعلق جناب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا: ''فقیر کی شان کے شایان یہ ہے کہ وہ اپنے فقر سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کوئی دولت مند اپنی دولت سے کرتا ہے۔''

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

اگرچہ اقبالؒ کے دور میں برصغیر میں شیخ سعدیؒ کی گلستان و بوستان، نظامی گنجوی کا سکندر نامہ، دیوانِ شیرازی، مولانا روم کی مثنوی اور فردوسی کا شاہنامہ بہت مقبول تھے۔ اور اقبالؒ نے فارسی زبان کے مشہور صوفی شعرا میں سنائی، فریدالدین عطّار، رومیؒ اور دیگر شعراء کے افکار کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے سب سے زیادہ متاثر مولانا روم کے افکار سے ہوئے تھے۔ اقبالؒ مولانا رومؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور انہیں ''پیر رومی''، ''پیرِ حق سرشت'' اور ''مرشد رومی'' کے لقب سے پکارتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی ہر فارسی کتاب میں مولانا روم کا بطور خاص ذکر کر کے ان کے روحانی فیضان کا اعتراف کیا ہے۔ اقبال کے کلام کی تمام خوبیاں رومیؒ کی تب و تاب کا ثمرہ ہیں۔ اس پاک باز کے نواز کی بدولت ہی اقبالؒ عشق و مستی کے اسرار سے واقف ہوئے۔ یہ انہی کے فیض کا نتیجہ ہے کہ ''دل کی دنیا کا دروازہ میرے لیے کھل گیا اور میں مقامِ کبریائی کے سرور سے آشنا ہوا۔

نصیب از آتشے دارم کہ اوّل
سنائی از دلِ رومیؒ برانگیخت

علامہ اقبالؒ نہ صرف پاک و ہند کے عظیم شاعر ہیں اور انہیں حکیم الامت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے بلکہ انہیں عالم اسلام کے عظیم مفکر، فلسفی، حکیم اور شاعر ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ آپ کی شاعری میں فکر اقبالؒ کے ساتھ ساتھ آپ فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری اصلاحی اور تبلیغی ہونے کے باوصف اُن کی شاعری فن کے جملہ لوازمات سے مزّین ہے۔ فکری اور معنوی لحاظ سے اقبالؒ نے اُردو اور فارسی شاعری کو بڑی وسعت عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنی فکرِ رسا اور زورِ قلم کی بدولت ہمیں یہ محسوس کرایا کہ وہ بات جو انسان کے قلب کو متاثر کرتی ہے شاعری کی دنیا میں داخل ہے۔ اقبالؒ نے گُل و بلبل کی فرضی حکایات، حسن و عشق اور ہجر و وصال کی داستانوں کی بجائے تعلیم و سیاست، معیشت، معاشرت، مذہب، اخلاق، فقر، خودی، عشق، فرد و ملت کا باہمی روابط اور دیگر بصیرت افروز موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اقبالؒ کی شاعری کا آفاقی رنگ انہیں ہر دور کا شاعر بنا دیتا ہے۔

مولانا رومؒ اور اقبالؒ کے افکار و کلام اور افکار کی مماثلت کی یوں مثال دی جاسکتی ہے کہ جس طرح مولانا رومؒ نے مسلمانوں کو قرآن پاک کا پیغام سنایا، اسی طرح اقبالؒ نے اپنی ملت کو کلام الٰہی کی طرف بلایا۔ مولانا روم نے مثنوی روم کے چھ دفاتر میں اپنے زمانے کے مثنوی کا اور اقبالؒ نے عصر حاضر کے مثنوی کا مقابلہ کیا۔ اقبالؒ نے عقل کے مقابلے میں اس (فقر) کو اپنی زندگی کا امام بنایا ہے:

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من ، عقل است غلامِ من

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں فقر کا تصوّر بھی اسلامی ہے۔ بطور ایک اصطلاح کے یہ مفلسی اور محتاجی اور احتیاج و گدائی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اقبالؒ کے نزدیک فقر سے مراد استغناء اور قناعت یعنی دولت سے لاپرواہی ہے، جو ایک مسلمان کے کردار کی نمایاں صفت ہے۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (مجھے فقر پر فخر ہے)۔ اور اسی لیے اسلام کا دوسرا نام فقر غیور ہے۔ گویا اقبال کے ہاں یہ لفظ بھی عام معنی میں نہیں بلکہ اپنے علامتی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس کی اپنی صفات ہیں۔

اقبالؒ کے کلام میں اس عشق (فقر) سے مراد عشقِ الٰہی اور عشق رسولؐ ہے۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل
یک نگاہ راہ بیں ، یک زندہ دل (11)

.....

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است (12)

''باید گفت کہ فقر دو نوع است: نوع اول بعلتِ احوال نامساعد مثل بلا و حادثہ بر آدم مستولی شود۔ نوع دوم آنست کہ باوصف مہیّا بودن ہمہ اسباب تمّول، آدمی خود بہ رضا و رغبت خویش آن را انتخاب نماید۔ مسلّم است فقری کہ انتخاب خود آدم است برای روح و قلب و مغز اضطراب و عذاب ندارد۔ برعکس ایں فقر آدمی را شعور تسخیر ارزانی می دارد و او را از شادمانی و سرور سرشار می کند۔ بدین سبب است کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ در کتاب ''غنیۃ الطالبین'' می نویسد'' ایں درخورِ شانِ فقیر است کہ فقر خود را آں اندازہ ای دوست داشتہ باشد کہ دولتمند دولت خود را۔ ثروت مند بغایت می کوشد کہ در ثروتش خدشہ وارد نشود۔ ہمین طور برای فقیر لازم است کے فقر خود را از نقصان و زوال حفظ نماید۔''(13)

''فقر کہ مورد بحثِ ما است، فقرِ انعامی، اختیاری، انتخابی و اصطلاحی است کہ در کلامِ علامہ اقبالؒ آمدہ است ۔ فقری کہ در سرشتِ آدمی جوہر غنا و درویشی بہ ودیعت گزاردہ و او را از بند حرص و ہوس متاعِ دنیوی آزادی سازد، و با شانِ بی نیازی خداوندی نوازد۔ این واضح است شخص کہ از دست روزگار مفلس شدہ با شخصی کہ بارضای خویش تہی دستی را پذیرفتہ تفاوت می کند۔ باوصف اینکہ او صاحب مال و منال بود یا امکان داشت کہ صاحب مال شود، او با دولت مندیش یا امکان دولتمند شدنش از دولت اجتناب کند۔ حقیقتاً اجتنابش انکار است، از گرفتار شدن بدام ہوس۔ ولی این عالم آزادی و بی نیازی بسہولت بدست نمی آید۔ این منزل را فقط اہلِ عزم و ہمت می توانند طے کنند۔''(14)

پروفیسر عزیز احمد اپنی کتاب ''اقبال۔ نئی تشکیل'' میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال کے انسانِ کامل کی نمود فقر ہی میں ممکن ہے اور فقر کی کئی خصوصیتیں ہیں جن کا انہوں نے بار بار تذکرہ کیا ہے۔ ایک بڑی خصوصیت ''یقین'' ہے۔ یہ اپنے وجدان پر ایک طرح کا اندرونی پختہ عقیدہ ہے۔ جب تک یقین نہ ہو، وجدان احتساب کائنات کے

لیے عامل اور موثر نہیں ہوسکتا۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

یہ یقین وہی صفت ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ انسانِ کامل کی نمود کے ساتھ آزادی لازمی آتی ہے۔ لیکن اس آزادی کا ذریعہ ہی یقین ہے۔ یہ یقین تقدیرِ الٰہی کو بدل سکتا ہے۔ اس سے علم اشیاء نہ صرف حاصل ہوتا ہے بلکہ علم اشیاء کے ذریعے ساری فطرت پر حکومت انسان کے لیے ممکن ہوسکتی ہے۔(15)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

.....

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

.....

ولایت ، بادشاہی ، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

یقین ہی سے فقر میں وہ دبدبہ اور شاہانہ شان وشوکت پیدا ہوتی ہے جس سے مادی دنیا کی تسخیر ممکن ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

انسانِ کامل کی اس صفتِ عالیہ یعنی فقر کے اثر اور عمل کا ذریعہ وجدان ہے۔ عقلی علم جو انسان کے لیے بہت کافی ہے۔ انسانِ کامل کی ضروریات اور اس کے عمل کی وسعت کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے فقر اور علم عقلی میں بڑا فرق ہے۔ فقر قلب ونگاہ کی ایسی پاکیزگی چاہتا ہے۔ جو عقل وخرد کی اس پاکی سے مختلف شے ہے جس کا حصول علم کے ذریعے ہوتا ہے۔ علم کا مقصد نظریاتی آگاہی ہے۔ فقر کا مقصد عمل اور حرکی اصلاح ہے۔ جو بات علم معلوم کرنا چاہتا ہے وہ فقر کو پہلے ہی سے معلوم ہے۔ فقر میں آگاہی کی مستی ہے لیکن علم میں مستی روا نہیں۔ کیونکہ علم نے ابھی شعور سے آگاہی کا راستہ پوری طرح طے نہیں کیا۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

.....

علم ، فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر ، مقامِ نظر ، علم مقامِ خبر
فقر میں مستیٔ ثواب ، علم میں مستیٔ گناہ

چونکہ فقر (خودداری) کا تعلق عمل سے بہت زیادہ ہے۔اس لیے فقر کا صحیح اندازہ اقتصادی حالات کے واسطے سے کیا جا سکتا ہے۔فقر کی ایک بہت بڑی خصوصیت غیرت ہے۔ یہ ایک طرح کی اقتصادی اور معاشی خودداری ہے جس کے بغیر انسانِ کامل کا فقر ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔فقر غیور، گدایانہ فقر سے بالکل متضاد ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین ''افکار و تصورات اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''اسلامی فقر، ایک جبروتی قوت ہے جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی زندگی میں ہوا۔ اور جس کی غیرت و خودداری ، جاں بازی و سرفروشی کے سامنے قیصر و کسریٰ کی طاقتیں سرنگوں ہو گئیں۔ اسلامی ، غیرت دینی، غنائے نفس اور معرفتِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بیدار کر کے قربانی، ایثار اور اشاعتِ دین کی طرف مائل کرتا ہے۔''(16)

فقر ایک ایسی اعلیٰ ذہنی کیفیت کا نام ہے جس کے زیر اثر انسان اعلیٰ مقاصد کے لیے پیہم جدوجہد تو کرتا ہے لیکن کسی تعریف و توصیف یا معاوضہ وصلہ کا آرزومند نہیں ہوتا۔

یہی وہ مقام ہے جب کہ ساری کائنات صاحبِ فقر کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے لیکن وہ ان سے بے نیاز

ہوتا ہے۔اس طرح صاحبِ فقر اپنے محبوب (خدا) کی صفت بے نیازی کو اپنے اندر جذب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اس سے صاحبِ فقر کو وہ شان وشوکت عطا ہوتی ہے جس کا تصور بھی ممکن نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کہتے ہیں:

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ:

﴿نہ سُست بنو اور نہ کسی قسم کا غم کھاؤ۔کیونکہ اگر تم ایمان رکھتے ہو،تو غلبہ اور اقتدار ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔﴾ (آلِ عمران۔آیت 139)

یہی وجہ ہے کہ صاحبِ فقر،عیش وآرام کی تمنا نہیں کرتا بلکہ وہ انقلاب چاہتا ہے۔طوفانوں سے ٹکراتا اور موجِ بلاخیز سے نبرد آزما ہوتا ہے تاکہ روح و بدن کی بالیدگی کا سلسلہ جاری رہے اور اس کی خود آزاد ہو کر ظاہر ہو جائے۔یہی وہ لوگ ہیں جن کی راتیں مصلّوں کی پشت پر اور دن گھوڑوں کی پشت پر بسر ہوتے ہیں۔یہی وہ صاحبِ فقر ہے جس نے بسا اوقات پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر جہاد کیا۔

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں ، جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

فقر یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر باطن قوت کو ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا جائے اور اپنے اُلجھے ہوئے معاملات کو خود سلجھائے۔یہ کسی کا دست نگر اور محتاج نہ ہو۔

فقرِ خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراکِ او سُلطان و میر

فقر ارتقائے خودی سے حاصل ہوتا ہے اور خودی کے لیے گدائی اور سوال موت ہے۔یہ گدائی جس طرح کی ہو، معاشی، ذہنی، سیاسی عقلی فقر کے لیے ممنوع ہے۔جہاں فقر نے بجائے اجتہاد اور اکتساب کے گداگری شروع کی، خودی کا خاتمہ ہو گیا اور فقر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔انسانِ کامل کو اپنا رزق اور اپنا آب و دانہ خود تلاش کرنا چاہیے۔وہ کسی قسم کے موروثی یا عطا کردہ رزق یا جبر اور دھوکے کی خوراک پر درویشی قائم نہیں رکھ سکتا۔''

از سوال افلاس گردد خوارتر
از گدائی گدیہ گر نا دار تر

''ہر وہ چیز جو بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو، سوال ہے''

اس تصور سے وراثت کے قانون پر بھی کاری ضرب لگتی ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

انسانِ کامل کے لیے ممکن نہیں کہ وہ کسی طرح کی مصیبت یا تکلیف کی شکایت بیان کرے۔ کیونکہ یہ اس کے فقر کے شایانِ شان نہیں صرف گدا یا فقر زمانے کی سختی کی شکایت کرسکتا ہے۔ انسانِ کامل کا کام تو سختیِ دوراں کا قلع قمع کرنا ہے:

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

انسانِ کامل کی یہ آزادہ روی، آزادیٔ کردار کی طرح آزادیٔ گفتار میں بھی نمایاں ہے۔ قلندر یا انسانِ کامل کا روحانی پرتو خصوصیت سے آزادیٔ گفتار کی قدر کو نمایاں مقام دیتا ہے:

ہزار خوف ہے لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

قوتِ حیدریؓ ایسا وصف ہے جسے اقبالؒ ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد میں جلوہ گر دیکھنے کے آرزومند تھے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو توحیدِ حق پر غیر متزلزل ایمان اور دنیاوی آلائشوں کو مسترد کر کے بے نیازی کی شان سے پیدا ہوتی ہے۔ قوتِ حیدری کسی دولت یا وسیلے کی محتاج نہیں۔ لیکن انسان شخصیت میں اس چنگاری کا وجود لازم ہے۔ قوتِ حیدری کی اصل روح یہ ہے:

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

اقبالؒ کے نزدیک یہ قوتِ حیدری اتنی قیمتی متاع ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام دولت بلکہ تمام حکمت ودانش کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔

میرے لیے فقط زورِ حیدری کافی
تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کے مطابق:

''ظلم واستبداد کی قوتوں کو شکست دینے کے لیے بندۂ مومن کو جس قوت کی ضرورت ہے اس میں قوتِ حیدری، صدق واستغنائے سلمانی اور فقر بوذری کو بنیادی اوصاف کی حیثیت حاصل ہے۔''(17)

مٹایا قیصروکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدر ، فقر بوذر صدقِ سلمانی

اقبال کے نزدیک قوتِ حیدری اور استغنائے سلمانی میسر نہ ہو تو سلطنت وحکمت بھی بے کار اور بے معنی ہے۔

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

عصر حاضر کی ملتِ اسلامیہ کا نوجوان جہاں پاک بازی و بے نیازی، طہارتِ نفس اور صاف دلی کا محتاج ہے، وہاں اسے بازوئے حیدر کی بھی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ اقبالؒ نوجوانانِ ملت اسلامیہ کے لیے مہر ووفا اور خدا شناسی کی دعا کرتے ہیں:

دلوں کو مرکزِ مہرووفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

ملت اسلامیہ کو ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو پاکیزہ کردار اور گھریلو اسلامی تربیت کی بدولت پیدا ہونے والے جذبہ دروں سے سرشار دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز اور قوتِ حیدری سے پوری طرح متصّف ہوں۔

بدہ او را جوانے پاک بازے
سروش از شرابے خانہ سازے
قوی بازوئے اور مانند حیدرؓ
دل اواز دوگیتی بے نیازے

اقبال کے ہاں فقرِ حیدری سے گہرا ربط رکھتا ہے۔توحید اصل ایمان بلکہ ایمان کا حرفِ اول ہے۔لیکن فقر اس ایمان کا حرف ثانی ہے جہاں توحید بندہ مومن کو تمام معبودانِ باطل کے خوف سے بے نیاز کرتی ہے وہاں فقر بندۂ مومن کو دنیا کی تمام آلائشوں سے بے نیاز کر کے گروہ آزاداں کی دنیا میں لے آتا ہے۔جہاں غیر اللہ کا خوف اور دنیا و مافیہا کے لالچ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔اقبالؒ توحید کو اسلام کی خشتِ اول اور فقر کو خشتِ ثانی قرار دیتے ہیں۔ان کے خیال میں فولادی شمشیر فقر اسی بیت کا مصرع ثانی ہے۔گویا شریعت ایک بیت اور توحید و فقر اس کے دو مصرعے ہیں۔توحید ایک پُر اثر قوت ہے جبکہ فقر اس قوت کا منطقی نتیجہ ہے فقر و توحید کے امتزاج سے ہی بندۂ مومن کبھی خالد سیف اللہؓ اور کبھی حیدر کرارؓ بنتا ہے۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار ؟
اس بیت کا یہ مصرع اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرع ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ

اقبال اس نوجوان کو اپنی ملّت کی آنکھ کا تارا تصور کرتے ہیں جو فقرِ حیدری کی صفت سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ شبابِ بے داغ کا بھی مالک ہو۔ضربِ کاری ایسے نوجوان کے ہاتھ کا کرشمہ ہوتا ہے جو بزم میں ریشم اور رزم میں شیرِ بیشہ بن جاتا ہے۔یہی جوان ملت کے تن مردہ میں نئی روح پھونک سکتا ہے۔اس کا سوز دروں راکھ کے ڈھیر کو بھی شعلہ صفت بنا سکتا ہے۔سرمایۂ فقر سے شکوہِ سلطانی ایسے ہی نوجوان کا مقدر بنتا ہے۔

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں حیدری و کراری

مومن کے لیے غیر اللہ سے بے نیازی لازم ہے تا کہ وہ خلوص دل کے ساتھ دنیا اور اہلِ دنیا کے لیے بھلائی کے کام کر سکے۔ کسی سے شکوۂ دوراں نہ کرے اور کسی کے سامنے دستِ نیاز نہ پھیلائے۔ مگر یہ ایسی صورت ممکن ہے جب بندۂ مومن قناعت کا وہ راستہ اختیار کرے جو فقرِ حیدری تک لے جاتا ہے۔ فقرِ حیدری کی بے نیازی نانِ جویں پر گزر کرتے ہوئے وقت کے مرحبوں کی گردنیں توڑنے اور اپنے عہد کے خیبر صفت مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

چوں علیؓ درساز با نانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

علامہ اقبالؒ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں سے بے حد اُمیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ اور ان کو اپنے اسلاف کی روحانی سرمایہ سے استفادہ کی تلقین فرماتے ہیں۔ اقبالؒ "جواب شکوہ" میں اپنے عہد کے مسلمانوں میں اسلاف کی روحانیت مفقود پا کر انہیں حضرت عثمان غنی جیسے سخی دل اور فیاض طبیعت دولت مند بننے اور فقیر حیدری کی بے نیازی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی دولتِ عثمانی اور فقر حیدری سے محرومی کے باعث ذِلّت کی سیاہ رات مسلمانوں کا مقدر بن گئی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم دولتِ عثمانی اور فقر حیدری کی تعلیم دیتا ہے اور بندۂ مومن کو نیابت الٰہی کا مستحق بناتا ہے۔

حیدری فقر ہے نہ دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اقبال کے نزدیک فقر حیدری تو سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی اسے پائے حقارت سے ٹھکرا کر صرف نانِ جویں پر اکتفا کرنے کا نام ہے۔ یہی فقر حیدری ہے جو خیبر شکنی کا اہل ہے۔ فقر و فاقہ کشی کا شکار، نانِ جویں پر گزر کرنے پر مجبور مسلمان تو لکیر کا فقیر اور عاجز و ناکارہ انسان ہے اسے فقرِ حیدری سے کیا نسبت؟

ہزار خیبروصد گنا اژدر است این جا
نہ ہو کہ نانِ جویں خورد حیدری داند

فقروقوتِ حیدری کے یک جا ہونے سے ''اسداللّٰہی'' وجود میں آتی ہے۔قوتِ حیدری بھی میسر ہواور فقرِ حیدری کی دولت بھی ہاتھ آ جائے تو پھر بندۂ مومن ''اسداللّٰہی'' ہے۔اقبالؒ کے نزدیک شیرِ خدا وہ ہے جو بے نیازی کے کمال اورقوت کی انتہا پر ہوتے ہوئے صرف حق اور اہلِ حق کی خاطر باطن قوتوں سے پنجہ آزمائی کرتا ہے۔حق پرستی وحق شناسی اورحق کی خاطر زورآزمائی ''اسداللّٰہی'' کہلاتی ہے۔

داراوسکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی

....

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ''ارمغانِ حجاز'' میں اپنے قلبی جذبات کا بھرپور اظہار کیا اور ملت اسلامیہ کے جوانوں کے لیے دعا مانگی کہ ان کی وفات کے بعد ان کی خاک سے ایک گلستان وجود میں آئے۔اوران کے آنسوخون کی آمیزش سے اُمت اسلامیہ کے لیے کشش واہتمام کا باعث بن جائیں۔اگر ''ذوالفقارِحیدری'' میسر نہ ہوں تو کم سے کم وہ نظر ہی عطا ہو جائے جو اس شمشیرخاراشگاف کی سی تیزی سے بہرہ ورہو۔

اقبالؒ رحمتہ اللہ علیہ کی فکر بڑی وسیع اور بلیغ تھی۔انہوں نے ہرنکتہ کی جانچ پڑتال اوراس کو قرآنی نظریہ کے مطابق پرکھا۔

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(للسان الغیب۔حافظ شیرازی)

وہ سمجھ گئے کہ صرف قرآن پاک ہی کا نظریہ حیات ان مسائل کا حل پیش کرسکتا ہے۔وہ رہبانیت کو بُزدلانہ اور فراری ذہنیت کا نتیجہ سمجھتے کیونکہ انہوں نے لا رھبانیۃ فی الاسلام کی تفسیر سمجھ لی تھی۔انہوں نے جان لیا کہ ہواوہوس کے طوفان خیز دریا میں لاَ اِلٰہ اِلاَّ اللہ کے بادبان والی کشتیٔ فقر پرسوار ہوکر سیر طغیان بھی ممکن ہے۔اور بیڑا ابھی پار لگ

سکتا ہے۔ ان کی جوان ہمتی اور شیرانہ حوصلہ ہرگز پسند نہ کرتا تھا کہ سُبک سارانِ ساحل رہیں بلکہ ان کی اولوالعزمی کا تقاضا تھا کہ اس منجدھار میں گرفتار اور ڈوبتے ہوئے انسانوں کو وہ کشتیٔ نوح دکھائیں جس کا ناخدا رحمتہ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سند پائے ہوئے ہے اور جو موجوں کا دل چیرتی ہوئی سیدھی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہے۔ چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ کفر کی تاریکی میں شرک کے تھپیڑے کھا کر بہت سے فرزندانِ نوح گردابِ ادبار میں پھنس کر ڈوبتے جا رہے ہیں۔ تو انہوں نے رسیلے اور اونچے سُروں میں اپنا راگ الاپ کر ڈوبتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ فقر حجازی کی کشتی کی طرف منعطف کرنی شروع کی۔

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

ایس ایم نقوی اقبال کے تصورِ فقر کی بنیاد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''علامہ اقبالؒ کا تصوّرِ فقر کا سنگ بنیاد لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ ہے۔ اسی پر اُن کے نظریہ کی پوری عمارت قائم ہے۔ وہ لَا اِلٰہ میں انسانیت کی معراج دیکھتے ہیں۔ اور ان کو اپنی فوقیت کا یقین دوسری مخلوقات سے اتنا بلند و بالا کر دیتا ہے کہ وہ بے نیازی کو غیرتِ انسانی کا تقاضا سمجھتے ہیں اور اِلَّا اللہ سے وہ توازن انسانیت پیدا ہوتا ہے جو ان کو کبر و نخوت سے محفوظ رکھ کر تمام روئے زمین پر تصرف کا حق بخشتا ہے۔ اسی رمز کو سمجھنا خودی کی معرفت ہے جو عملاً فقر کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔'' (18)

خودی ہے سرنہاں لا الٰہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ سناں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بزدلی اور روباہی کلمہ لَا اِلٰـہ اِلَا اللّٰـہ کے بعد رہنا ہی نہیں چاہیے اور غیر اللہ کا خوف دل سے نکل جانا چاہیے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کی گم اس میں ہیں آفاق

تاعصائے لَا اِلٰہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

.....

ہر کہ حق باشد چوں اندر تنش
خم نہ گرد پیش باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرغوب غیراللہ نیست

صفدر حسین اپنے مضمون ''اقبالؒ کے فلسفہ فقر'' میں لکھتے ہیں:

''تصوّف محض ایک لفظ ہی نہیں بلکہ فکر وعمل کا ایک ایسا دبستان ہے جس کا مقصد انسان کو صراطِ مستقیم دکھانا ہے۔ اس میں شریعت بھی ہے اور طریقت بھی۔ تصوّف کی راہ پر چلنے والے ذاتِ حق تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا زینہ ہے جو انسان کو صوری و معنوی جملہ کمالات کی معراج پر پہنچا دیتا ہے۔ اہل تصوّف کے نزدیک طریقت وشریعت لازم وملزوم ہیں۔ السیّد بن حارث دمشقی اسرار السالکین میں لکھتے ہیں کہ طریقت، حقیقت اور معرفت دراصل پابندی شریعت کی آخری حد کا نام ہے۔ جو اصحاب تصوّف کی درسگاہ میں داخل ہوتے ہیں وہ اخلاق فاضلہ، روحانی کمالات اور انسانیت وکبریٰ کی سند فضیلت لے کر وہاں سے نکلتے ہیں اور پھر صحیح معنوں میں مخلوق خدا کی رہبری اور انسانیت کی خدمت کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ یہ تصوّف ہی تھا کہ مولانا رومیؒ استغراق میں رہتے تھے لیکن نماز کے وقت ہوش میں آجاتے اور نماز پوری طرح ادا کرتے۔''(19)

تصوّف کی ابتدا دین اسلام کی ابتدا کے ساتھ ہوگئی تھی۔ تصوّف کی تعلیمات بھی قرآن وحدیث سے باہر نہیں۔ تصوّف کے ان سب مقولوں میں جو روح کارفرما ہے وہ ''حقیقت مطلقہ کی تلاش'' ہے۔ اس غرض سے ترک ماسوااللہ، رجوع اللہ، قناعت وتوکّل، تسلیم ورضا اور تزکیہ نفس جیسے اصول وضع کیے گئے ہیں۔ ان مقامات تصوّف میں فقر کا مقام بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

فقر کے لغوی معنی ،تنگ دستی ،غریبی اور مفلسی کے ہیں ۔اور فقیر وہ ہوتا ہے جو غریب ،تنگ دست اور مفلس ہو۔قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: ''اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو۔اللہ تو بے نیاز ہے۔اور جملہ خوبیوں کا مالک ہے'' اس آیت کریمہ کہ روشنی میں فقیر صرف اس ذات واحد کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے سوا کسی سے حاجت وضرورت کی التجا نہیں کرتا بلکہ اس کا قلب غنی ہو جاتا ہے اور شان بے نیازی پیدا ہوتی ہے۔۔۔غنی وہ ہے جس کا قلب غنی ہو۔اگر چہ مال وزر اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔جس شخص کا قلب کائنات سے بے نیاز ہو وہ شخص صحیح معنوں میں مومن کہلانے کا مستحق ہے۔اسلام میں تصوّف کا یہ تصوّرِ فقر مسیحی تصوّف سے بہت مختلف ہے۔

جہاں فقر، مفلسی ،غریبی اور گداگری معنوں میں مستعمل ہے۔جو اسلام میں مذموم ومکروہ ہے اور اس کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔

اقبال جو برّعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کے مبلغ اعظم بھی تھے۔انہوں نے فقر کو قرآن کے اصولوں کے عین مطابق بیان کیا۔ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''فقر سے مراد افلاس وتنگ دستی نہیں بلکہ استغنا و دولت سے لاپرواہی ہے۔''

میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
(بالِ جبریل)

اقبالؒ نے فقر کو ''غنا'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور وہ استغنا سے مراد اجتناب اور بے رغبتی لیتے ہیں۔ ایسی بے رغبتی جو ارادی ہو۔بلکہ اقبالؒ کے بقول اصل ''فقر'' تو غنائے نفسی کا نام ہے۔اقبالؒ فرماتے ہیں:

دری قبای خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی
(اسرار ورموز)

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین ''علامہ اقبال کے دیگر صوفیانہ نظریات'' میں رقم طراز ہیں:

''اسلامی تصوّف میں مقام ''فقر'' ایک ایسی قلبی صفت اور کیفیت کا نام ہے جو سالک کو راہِ سلوک میں پیش آتی ہے۔اور سالک کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ دنیا کی

آلائشوں سے اس کا ماحول بے زار ہو جاتا ہے اور اس کی تمام خواہش خدا کی ذات کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس سے صوفی کو جو لذت قلب میسر آتی ہے اس کو صفحہ قرطاس پر لانا محال ہے۔ اس کو تو اقبالؒ جیسا مرد قلندر ہی بیان کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے فقر کے لئے ''فقر''، ''قلندری''، درویشی اور رندی جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔''(20)

تطہیر نفس (عفتِ قلب ونظر)

گویا فقر قلب ونظر کی عفت اور طہارت و پاکیزگی کا نام ہے جس سے دنیاوی تحریصات چھوٹ جاتی ہیں جس سے نفس اور آفاق پر حکمرانی کے زریں اصولوں کو اپنانے میں مدد ملتی ہے۔ اس کی بنیاد مراقبے اور تطہیر نفس کے اصولوں پر ہے۔ جس کی عظیم اور روشن مثال رحمت اللعالمین و مدینۃ العلم ﷺ کی حیات طیبہ میں ملتی ہے اور اس کی توسیع کا سرچشمہ باب العلم حضرت علیؓ کی سیرت میں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہی وہ فقر ہے جو درویشی، رندی اور قلندری کی طرف مائل کرتا ہے۔ قلب میں روشنی اور مزاج میں جلا پیدا کرتا ہے۔ دل ونگاہ بدل جاتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک دراصل اسی فقر کا نام ''فقر حجازی'' ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی فقر کو ڈھونڈنے کا درس دیتے ہیں اور یوں تلقین کرتے ہیں:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر غیّور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

علامہ اقبالؒ ''فقرِ حجازی'' اور ''فقرِ رہبانی'' میں بے حد فرق جانتے ہیں اور اس کو یوں بیان فرماتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہاں گیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دل گیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر سے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری (21)

....

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا ''موجود'' اور فقر کا ''موجود'' اور
اَشْھدُ اَن لَّا اِلٰہ، اَشْھدُ اَن لَّا اِلٰہ (22)

''اقبال کے نظامِ فکر میں ''خودی'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس نے اقبالؒ کو تصوّف کے نظامِ فکر میں ممتاز بنا دیا ہے۔ تصوّف میں عشق کے بغیر تعین اور ذات یا خودشناسی کی منازل طے نہیں ہوتیں۔ اور فقر ان دونوں خصوصیات کا حامل ہے۔ حجازی فقر میں جب تیغ خودی پڑتی ہے تو اس کی قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔''(23)

اقبالؒ ایسے فقر سے گریزاں اور نالاں ہیں جو خودی کو تقویت دینے کے بجائے ضعف پہنچائے۔

علامہ اقبالؒ ساقی نامہ، (بالِ جبریل) میں یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے، تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے، بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بُوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں تابناک
من و تو میں پیدا ، من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسّس کی راہیں بدلتی ہوئی
سُبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے ، شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشمین تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے (ساقی نامہ(بالِ جبریل)

.....

خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید
زمین اس کی صیر، آسماں اس کا صید

.....

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگاہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ (24)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ''فقر'' اصل میں فقر قرآنی ہے۔ جو انسان کو رہبانیت سے نکال کر تسخیر کائنات کی طرف لے آتا ہے۔ مکتوباتِ اقبالؒ میں اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں حقیقتِ اسلام کو ''فقرِ غیور'' کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ اور یوں کہتے ہیں: ''اسلام کی حقیقت فقرِ غیور رہے اور بس'' (25)

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فقرِ قرآنی میں رہبانیت اور ترکِ دنیا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

علامہ اقبالؒ کے تصورِ فقر میں انسانِ کامل کا فقر رہبانیت کے برعکس ہے۔ بے شک انسانِ کامل کی ایک بڑی خصوصیت ادب یا تربیتِ نفس ہے۔ یہ رہبانیت کے بالکل برعکس ہے۔

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

.....

حدیثِ بندۂ مومن دلآویز
جگر پُرخوں، نفس روشن، نگاہ تیز

میسر ہو کسے دیدار اس کا
کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ رہبانیت فقر کے منافی ہے۔ کیونکہ انسانِ کامل کے فقر اور فقرِ کافر (رہبانیت) میں بنیادی فرق ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ فقر اپنی خودی کی بنا پر کائنات کی تسخیر کرتا ہے جبکہ رہبانیت جنگل میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔

فقر کافر خلوتِ دشت و دراست
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
آں خدا را جُستن از ترکِ بدن
ایں خودی را برخانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و وا سوختن
ایں خودی راچوں چراغ افروختن

علامہ اقبالؒ کے مطابق فقر روح و بدن کی ضروریات کو مدنظر رکھتا ہے جبکہ رہبانیت سکون پرست ہے۔ اور فقر حرکی اور رواں دواں ہے۔

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بے راز
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وا نمود اس کی
کہ ہے نہایتِ مومن خود کی عریانی

فقر کا کام رہبانیت کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینا نہیں۔ کیونکہ رہبانیت خانقاہوں میں پناہ لیتی ہے۔ اس کا رجحان پسپائی ہے۔ وہ دراصل زندگی اور فطرت کے معرکوں سے گریز کرتی ہے۔

علامہ اقبالؒ ملتِ اسلامیہ کو واشگاف الفاظ میں تلقین کرتے ہیں کہ جس قوم میں رہبانیت کا رجحان ہو اس قوم کی زندگی کے دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

تیرے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

علامہ اقبالؒ کے مطابق فقر، فقرِ قرآنی ہے۔ قرآنی فقر احتسابِ کائنات اور تسخیر جہات ہے۔

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ کافر، خلوت دشت و دراست
فقرِ مومن، لرزہ بحر و بر است
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ
زندگی ایں را زمرگِ باشکوہ

علامہ اقبالؒ کے تصورِ فقر کے مطابق انسان کامل یا مردِ مومن زمانے کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ زمانہ اس کے فیصلوں کے تابع ہوتا ہے۔ وہ وقت کا شکار نہیں ہوتا بلکہ خود شکاری ہوتا ہے۔ قلندری کی یہی پہچان ہے۔ مومن زمان و مکان میں گم نہیں ہوتا بلکہ زمان و مکان کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے تصورِ فقر میں بڑی شوکت اور دبدبہ ہے۔ اس میں بے نیازی کی شاہانہ خصائص تو ہوتی ہیں مگر اس فقرِ غیور میں شاہانہ استبداد نہیں ہوتا۔

آں فقر کہ بے تیغ صد کشورِ دل گرد
از شوکتِ دارا بہ از فرِ فریدوں بہ

فقر کے لئے مادی قوت کا حصول بے حد ضروری ہوتا ہے اس میں جرأت اور قوت بھی ضروری ہے۔ فقر کیلئے دل اور فکر کی گرمی اور سرعت بھی ہونی چاہئے۔ تاکہ زمانے سے اپنے احکامات کی تکمیل کرا سکے۔

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سطنت پرویز

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو ذکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

علامہ اقبالؒ نے فقر کے اوصاف کے بارے میں بار بار ''شاہی'' اور ''سلطانی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب سلطانی جبر و قہر نہ لیا جائے بلکہ یہ سلطانی عشق و مستی اور وجدان کی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ فقر کی سلطانی دراصل خودی کی قاہری ہے۔

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبرو قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

عزیز احمد ''اقبالؒ۔ نئی تشکیل'' میں سلطانی فقر کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''فقر کی سلطانی دراصل انقلاب کی حکومت ہے۔ فقیر کا نعرہ انقلاب کا ہے۔ اس کا کام سامراجی یا طبقاتی جبر و استداد کے خلاف معرکہ آرائی کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ شاہی کا مدمقابل ہے اور شاہی کے مقابل میں وہ جمہور کی رہنمائی کرتا ہے۔ جب تک ایک بھی ایسا باغی، آزادی کیلئے لڑنے والا، جور و استبدار کا مقابلہ کرنے والا درویش کسی قوم میں باقی ہے اس قوم پر زوال نہیں آسکتا۔''(26)

فقر کی شانِ بے نیازی اور قوت و شوکت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال کے کلام سے فرماتے ہیں:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کرم اے شہؐ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تونے عطا کیا ہے جنہیں دماغ اسکندری

فقر کیلئے غیرت اور مادی اسباب سے بے نیازی طرۂ امتیاز ہے اس مقصد کیلئے علامہ اقبالؒ تاریخ اسلام اور اسلاف کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔

سماں (اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ) کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

اقبالؒ قلندری (فقر) کو افکار کی عظمت اور قلندری کے کھو جانے کو عظمت کے کھو جانے کے مترادف گردانتے ہیں اور قلندری ہی کو سلطنتوں کی معراج گردانتے ہیں:

آہ! کہ کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مال فقیری، سلطنتِ روم و شام

ایک اور مقام پر اسی فکر کو اقبالؒ نے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج اُن خانقاہوں میں ہے فقط رُو باہی
.....
نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی!
لذتِ نغمہ کہاں مُرغ خوش الحاں کے لئے
آہ! اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی
.....

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

جہاں تک اقبال کے ہاں بیداریٔ خودی کا تعلق ہے:

''علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں خودی اور اس کی تعمیر (بیداری) کے لئے بار بار تاکید فرماتے ہیں۔ اقبالؒ کا نظریۂ خودی درحقیقت عظمت آدم کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔ یہ قرآن حکیم کی اس تعلیم پر مبنی ہے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات ہے اور یہ کائنات اس کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔۔۔۔۔ یہیں اس شعور کی نمود ہوتی ہے، جسے اقبالؒ نے خودی کا نام دیا ہے۔''(27)

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

.....

فطرت کو دکھایا بھی دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تیری مے

اقبالؒ کے تصورِ فقر میں تعمیرِ خودی کا بار بار تذکرہ آتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت یا عرفانِ نفس ہے۔

اس ضمن میں اقبالؒ یوں فرماتے ہیں:

''او برنظریۂ حفظ ذات تکیہ دارد و اثباتِ نفس را تعلیم می دھد۔ نفس کمال نیافتہ از طریق انکار نفس کمال نمی یابد بلکہ از طریق تہذیب نفس و کمال یابی یعنی تقویت خودی در خویشتن مراحل تکامل و تطور را می پیماید۔''(28)

چون حیات عالم از زور خودی است
پس بہ قدر استواری زندگیست

.....

مثلِ حیوان خوردن، آسودن چہ سُود
گر بہ خود محکم نئی بودن چہ سُود
گرفنا خواہی ز خود آزاد شو
گر بقا خواہی بہ خود آباد شو

....

درا بہ مسجد ویاری خسرواں مطلب
کہ روز فقر نیاکان ما چنیں کردند

....

خودی کی شوخی و تندی میں کبرو ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

....

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبالؒ نے فقر کے لئے تعمیر خودی کے تین مرحلے بیان کئے ہیں:

''پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے جس کے مطابق مسرت وشادمانی آزادہ روی سے نہیں بلکہ ایک خاص ضابطۂ حیات سے حاصل کی جاسکتی ہے۔''

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

''دوسرا درجہ ضبط نفس کا ہے۔اس کے مطابق انسان کو اپنی خواہشات پر قابو پانا چاہئے۔''

عشق بتاں سے ہاتھ اُٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگاہ دیر میں، خون جگر نہ کر تلف

تیسرا درجہ نیابتِ الٰہی کا ہے اور اسے حاصل کرنا خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔(29)

علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیبؑ و شبانی شب و روز

فقر کے لئے تعمیر خودی کے لئے عشق اور سچی لگن کی انتہائی ضرورت ہے اسی لئے اقبالؒ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزوں و تار رفو

.....

بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

.....

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را نا ممکن ما ممکن است

....

عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریاں از لباس چون و چند

عقل می گوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن
عقل گوید شاد شو، آباد شو
عشق گوید بندہ شو، آزاد شو
عشق را آرام جاں حُریّت است
ناقہ اش سارباں حریت است

علامہ اقبال کے نزدیک فقر غیرت کا ہی دوسرا نام ہے۔ بقول صفدر حسین:

''علامہ اقبالؒ نے حقیقت اسلام کو ''فقر غیور'' کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ ان کے مطابق ''اسلام کے اس ''فقر غیور'' میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ تہی دستی کے باوجود انسان نظام کائنات کو اپنی منشا کے مطابق بدل سکتا ہے۔ جو شخص ایسے فقر کو عملی جامہ پہناتا ہے وہ اقبالؒ کی نظر میں ''مردِ حُر'' ہے جسے وہ کہیں ''مردِ حق'' اور ''مردِ مومن'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور کہیں ''فوق البشر'' کا نام بھی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی قوم کبھی بھی میدان میں شکست نہیں کھا سکتی اور نہ ہی وہ خوار ہوتی ہے جس کا فقر غیور ہو۔''(30)

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

جس قوم کے نوجوان اگر ''جسور و غیور'' ہو جائیں یہی ان کی ''سکندری'' ہوتی ہے کیونکہ صاحبِ فقر کے مقابلے میں مال و متاع اور دنیاوی سلطنت کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

.....

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے ! شاعری کیا ہے

.....

اب تیرا دور بھی آنے کو ہے اے فقر غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم (31)

.....

مسلمانے کہ داند رمز دیں را
نساید پیش غیراللہ جبیں را

اگر گردوں بکام او نہ گردد
بکام خود بگرداند زمیں را

اقبالؒ کے ہاں حضرت ابوذر غفاریؓ، فقر و استغنا اور بے نیازی اور درویشی کی زندہ و پائندہ اور زوردار علامت ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک قابل ستائش وہ فقر غیور ہے جو بے نیازی اور استغنا کی دولت سے مالا مال ہو۔ وسائل و اسباب مہیا ہونے کے باوجود قناعت و درویشی کو اپنائے۔ یہی فقر اور درویشی اقبالؒ کا مطلوب و مقصود اصلی ہے۔ اس فقر و درویشی کی نمائندگی متعدد اصحابِ رسول ﷺ کی عملی زندگیوں میں میسر آتی ہے۔ جو بلاشبہ ملتِ اسلامیہ کے درویش اول کہلانے کے مستحق اور فقر غیور کی علامت متصور ہوتے ہیں۔ اقبالؒ اس مردِ حق کی درویشی کو ''درویشانہ بوذریؓ'' سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نادرِ اخواں شہِ درویش خو
رحمتِ حق بر روانے پاک او
کارِ ملت محکم از تدبیر او
حافظِ دین مبیں شمشیر او
چوں ابوذرؓ خود گداز اندر نماز
ضربت ہنگام کیں خارا گداز

''دکتر شہین مقدم در ایقانِ اقبال ابن طوری گوید''

''در ''بالِ جبریل'' در قطعہ مسجد قرطبہ این اشعار سروده است''

ترجمہ شعر:۱ آہ آں مردانِ حق، آں شاہ سوار عرب
حامل '' خلق عظیم'' صاحب صدق و یقین
این رمز غریب از دولت ایشان فاش شد
کہ دولت اہل دل بہ فقر است بہ شاہی نیست

.....

ترجمہ شعر:۲ خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات
دل بی نیازش از ہر دو جہان غنی تراست

علامہ اقبالؒ کے نزدیک فقر، تصوّف اور روحانیت سر بزیری اور کم بختی یا زبوں حالی کا نام نہیں بلکہ ''فقر، اقبالؒ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کا متاع ہے اور اس متاع کو اقبالؒ نے اس لئے پسند کیا ہے کہ ان کے اور ہمارے آقائے نامدار کی زندگی فقر کی زندہ و پائندہ تفسیر و تصویر ہے۔(33)

فقر بر کروبیاں شب خوں زند
بر نوامیسِ جہاں شب خوں زند

.....

بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاج الماس می سازد ترا

یہ فقر، افلاس نہیں، دولت جاودانی ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی تاثیر کو یوں بیان کیا ہے:

زنہار ادھر کھولیو مت چشمِ حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں

اس کا تانا بانا قرآن کریم سے مرتب ہوتا ہے۔ یہ شرع محمدیؐ کا باطن اور زندگی کا ضمیر ہے:

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم
مرد درویشے نہ گنجد در گلیم
گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دمِ او گرمیٔ صد انجمن

یہ فقر کم ہمتی کا مداوا اور ذوقِ طلب کا خالق ہے۔

بے پراں را ذوق پروازے دھد
پشّہ را تمکین شہ بازے دھد

.....

با سلاطین برفتد مردِ فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر

قلب اورا قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطان نعرۂ او ''لاملوک''
حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

اقبالؒ کے لئے فقر اور قلندر متبادل الفاظ میں ہے۔ یوں بتاتے ہیں:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب ہیں راکب ہے قلندر

اور یہ ''فقر غیور'' ہی اقبالؒ کے نزدیک اصل دین اور اصل حیات ہے۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ''پیر حرم'' میں ذہنی انحطاط اور پراگندگی، انفعالیت اور مجہول پن، مصافِ زندگی سے بے رغبتی اور انحراف کا ماتم اس طرح کیا ہے:

اے پیر حرم رسم و رہ خانقاہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

علامہ اقبالؒ ''جاوید نامہ'' میں فرماتے ہیں:

جُز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جُز بہ ذکر

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ تصورِ فقر دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ذکر اور فکر ان کے اختلاط سے انسان میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ نے ان دونوں قوتوں کے مجموعہ کو ''فقر'' کا نام دیا ہے۔ تصورِ فقر ہی فلسفۂ خودی کی روحِ رواں ہے۔ انسان کی خودی کی تکمیل ہوتی ہی اس وقت ہے جب اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

فقر کی قدر و قیمت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے اندر شانِ فکر پیدا نہ کر سکے تو اس کی خودی اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتی اور فقر کی ماہیت یا تعریف یہ ہے کہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مترادف ہے۔ یعنی صاحبِ فقر وہ شخص ہے جس نے توحید کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو، جس کی زندگی سے توحید کا رنگ عیاں ہو، جو ہر حال میں توحید پر عمل کرتا ہو، جس نے اپنی روح کو توحید کے معنی سے ہم آہنگ کر لیا ہو۔

بہار اللہ بہار تفسیر اقبال میں لکھتے ہیں:

> ''ذکر کہتے ہیں اپنے نصب العین سے ایسی شدید محبت کرنے کو کہ وہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔'' ''فکر کہتے ہیں کائنات کی بناوٹ میں غور کرنا۔۔۔۔ جب ایک شخص اپنی فکر سے کام لے کر اللہ کی ہستی کا یقین پیدا کر لیتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے یعنی اس سے محبت کرتا ہے اور اسی کو ساری کائنات میں اپنا مقصود قرار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی طرف ملتفت یا متوجہ نہیں ہوتا۔ جب وہ پورے طور پر اسے اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے تو اقبالؒ کی اصطلاح میں اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس میں یہ شان پیدا ہو جاتی ہے تو وہ غیر معمولی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔''(34)

اقبالؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''عاشقانِ خدا'' یا ''مردانِ حُر'' کی صحبت کے بغیر محض کتابوں سے یہ شانِ فقر پیدا نہیں ہو سکتی۔

دل زدیں سر چشمۂ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتاب ، دیں از نظر

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردان حُر، آدم گر است
مردِ حُر دریائے ژرف و بے کراں
آبگیر از بحر و نے از نادراں
اے سرت گردم گریز از ما چو تیر
دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر
می نروید تخمِ دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

اقبال نے فقر کو صرف اپنے فکر کی آماجگاہ نہیں بنایا بلکہ اسے اپنی زندگی میں بھی برتا۔ فقر کی ایک لازمی شق استغنا ہے جو انسان کے اندر نیک طینتی اور احسانِ قلندری پیدا کر دیتا ہے۔ درویش اور قلندر دنیا میں رہنے کے باوجود خود کو اپنے گرد و پیش سے بلند کر لیتا ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی خود داری اور آزادی کے جوہر کو فنا نہیں ہونے دیتا۔ اس کی آزادی کی دولت ایسی ہے کہ وہ اس کے سامنے اور کسی دولت کو خاطر میں نہیں لاتا اور اپنے آپ کو بادشاہوں سے بھی زیادہ بلند مقام خیال کرتا ہے۔

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہی نیست
کو گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہی نیست

.....

بیا بہ مجلس اقبالؒ و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

.....

اقبالؒ قبا پوشد در کار جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہی نیست

.....

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گِل کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

.....

ز برون درگذشتم ز درون خانہ گفتم
سخنی نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

.....

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

.....

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدادار و جم

.....

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطان کی درسگاہ

.....

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

.....

امین راز ہے مردانِ حُر کی درویشی
کہ جبرِ عمل سے ہے اس کو نسبت خویشی

.....

خویشتن را اندر ایں آئینہ بیں
تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

.....

حکمتِ دین دل نوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

حضرت سلطان باہو نے فقر کو بادشاہی قرار دیا ہے کیونکہ فقر ہی انسان کو استغنا اور طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال کر کے اسے دینی اور دنیاوی فلاح کے راستے پر گامزن کر سکتا ہے۔ اقبالؒ مال و دولت دنیا پر اترانے کو ایک بہت بڑی غلطی تصور کرتے ہیں۔ کردار کی دولت زمان و مکاں پر حاوی ہے۔ انسانی زندگی کی ضروریات لامتناہی

ہیں۔لیکن استغنا انسان کو وہ دولت عطا کرتا ہے کہ انسان کو سر بلند رکھتا ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اسلام ترک دنیا نہیں سکھاتا۔اسی لئے رہبانیت کو پسند نہیں کیا گیا۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی اتباع کرے تاکہ اس کی خودی مستحکم ہوتا کہ کائنات کو تسخیر کر سکے۔

آں خودی را کُشتن و واسوختن
ایں خودی را چوں چراغ افروختن

اسلام کی تعلیمات کے مطابق قوانین کی اطاعت گزاری خودی کی تعمیر کے لیے لازمی ہے۔

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر
از نہیب او بہ لرزد ماہ و مہر

.....

مردِ حق باز آفریند خویش را
جُز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

فقر میں منازل طے کرنے کے لیے اُسوۂ حسنہ کی پیروی لازم ہے۔تاکہ انسان میں داخلی اور قلبی انقلاب پیدا ہو سکے۔

بر عیارِ مصطفٰے خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اقبال فقر کامل کو بھی رسول کریمؐ کی ذاتِ اقدس میں مجسم دیکھتے ہیں اور کبھی حضرت علیؓ کی شخصیت میں۔اس کا جلوہ انہیں کبھی حضرت فاروقؓ کی شکل میں نظر آتا ہے،کبھی ابوذر غفاریؓ کے سراپا میں اور کبھی حضرت سلمان فارسیؓ کے کردار ہیں۔

مٹایا قیصرو کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

.....

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابندِ نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم

زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
رشتۂ ما یک تولایش بس است
چشمِ مارا کیف صہبائش بس است
مستیِ او تا بخونِ ما دوید
کہنہ را آتش زد و نو آفرید

.....

عشق او سرمایۂ جمیعت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملّت است
اُمت او مثلِ او نور حق است
ہستیِ ما از وجودش مشتق است
ہر کہ پا دربند اقلیم وجد است
بے خبر از لم یلد لم یولد است
ای ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
ای زمین از بارگاہت ارجمند
آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن زر تاب روی تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوی تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات !
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

.....

درجہاں شمعِ حیات افروختی
بندگان را خواجگی آموختی

تادمِ تو آتشی از گُل کشود
تادمِ تو آتشی از گُل کشور
تودۂ ہای خاک را آدم نمود
ذرہ دامن گیر مہر و ماہ شد
یعنی از نیروئ خویش آگاہ شد

.....

ای فروغت صبح اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ مافی الصدور
درعمل پاینده تر گردان مرا
آب نیسانم گہر گردان مرا
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن
این خیاباں را ز خارم پاک کُن

فقرِ اقبالؒ میں عشق کی قوت مسلمہ ہے۔

اقبال ایسے عرفان مشرب مفکّر کے ہاں ''عشق'' کی افادیت مسلم ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک انسان اسرارِ عشق کا ایک راز ہے اور زندگی کا پوشیدہ راز عشق جوہر تخلیق ہے، سرمایۂ کائنات ہے۔ ایک بادوام عنصر ہے۔ حکمتِ الٰہی کی شعاع ہے، قوتِ خدائی کا مظہر ہے، بے کراں سمندر ہے، مستحکم پہاڑ ہے اور گنج ہزار گوشہ۔ اس نے انسان کو مسجود ملائک بنایا اور انسان کی پرواز حضرت جبریلؑ کی پرواز سے بڑھ گئی انسان نائب خدا ہے، اسمائے حُسنہ سے آگاہ ہے اور خدائی صفات کا پرتو وظِل ہے۔ زمین و آسمان کے قویٰ اس کے لیے مسخّر ہیں۔ اس کے قویٰ وہبی اور عطائی ہیں اور خداداد ذوق کے مطابق انسان کو جلا بھی دیتا رہتا ہے۔

دردو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سِرّی از اسرارِ عشق
سِرّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز سام و حام و روم و شام نیست

کوکبِ بی شرق و غرب و بی غروب
در مدارش نی شمال و نی جنوب
حرفِ اِنِّی جَاعِل تقدیر او
از زمیں تا آسماں تفسیر او
مرگ و قبرو حشر و نشر احوالِ اوست
نور و نارِ آں جہان اعمال اوست
او امام و او صلوٰۃ و او حرم
او مراد و او کتاب و او قلم
خردہ خردہ غیب او گردد حضور
نی حدود او را ملکش را نغور
از وجودش اعتبار ممکنات
اعتدالِ او عیارِ ممکنات
من چہ گویم از یم بی ساحلش
غرق اعصار و دہور اندر دلش
آنچہ در آدم بہ گنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و ماہ از جلوتش
نیست راہ جبریلؑ را در خلوتش
برتر از گردون مقام آدم است
اصل تہذیب احترامِ آدم است

.....

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مر زبوم ما بجز اسلام نیست

می نگنجد مسلم اندر مرزبوم
در دل او یاوہ گردد شام و روم

.....

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہانِ مجبور
خود گرے ،خود شکنے ، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستان ازل
حزر اے پردگیاں پردہ درے پیداشد

.....

آرزو بے خبراز خویش بہ آغوشِ حیات
چشم واکرد و جہانِ دگرے پیدا اشد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد
(پیام مشرق۔ افکار)

علامہ اقبالؒ عشق وفقر کو آپس میں متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔تا کہ اس کی اساسی بنیاد پر تسخیر کائنات کے مراحل ہوسکیں۔اقبالؒ اس فقر کے قائل ہیں جو حجازی الاصل ہے۔بالفاظ دیگر وہ مسیحی تصوّر حیات کے بھی سخت ترین اور کٹر ناقد ہیں اور عجمی تہذیب کے منفی موثرات کے بھی۔اُن کے تصوّر فقر میں انقیاد واطاعت الٰہی تطہیر وتزکیۂ نفس اور ہستی مطلق سے ارتباط اور اتصال کا وہ والہانہ جذبہ شامل ہے جو بنیادی اور مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

.....

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب (35)
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام ، صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکاں و مکیں، عشق زماں و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ یاب

.....

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابنِ الکتاب، عشق ہے اُم الکتاب (36)

علامہ اقبالؒ کو پرندوں میں شاہین اس لیے پسند ہے کہ اس میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بقول مولانا صلاح الدین احمد:

''اقبال شاہین میں فقر کے تمام تصوّرات کو یکجا دیکھتا ہے۔ اور اسے پرندوں کی دنیا کا درویش کہہ کر پکارتا ہے۔ فقر کی تیز نگاہی، فقر کی آزادروی، فقر کی بلند پروازی، فقر کی بے نیازی، فقر کی سخت کوشی اور فقر کا کسبِ حلال اسے شہباز میں مجسم نظر آتا ہے جو زمین کی پستی کی بجائے آسمان کی بلندیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ جو اپنا نشیمن چٹانوں میں بناتا ہے اور اپنا شکار جھپٹ کر مارتا ہے۔ اقبالؒ شاہین کو عہد حاضر کے نوجوان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔''(37)

خالص شعری سطح پر اقبالؒ نے فقر کے امین کے لیے شاہین کا رمز استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس پرندے میں جیسا کہ اقبالؒ نے بالصراحت کہا ہے، وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو استغنا، خارہ شگافی، علیحدگی، بے اعتنائی اپنے خون کی آگ میں جلنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چنانچہ ''بالِ جبریل'' کی ایک نظم میں اسی عنوان سے مندرجہ ذیل برجستہ اشعار ملتے ہیں:

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
ہے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ مین جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر !
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں (38)

شاہین

کیا میں اُس خاک داں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ باد بہاری ، نہ گُل چیں ، نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بُھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ
یہ پُورب ، یہ پچھّم، چکوروں کی دنیا
مِرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ (39)

اقبال کی جدت طرازی نے اُردو اور فارسی زبانوں کو اسالیب و موضوع کے علاوہ نئی نئی تمثیلات کی دولت بھی فراوانی سے عطا کی ہے۔ وہ اُردو یا فارسی کی فرسودہ اور پامال تمثیلات بلبل، کبک، طاؤس وغیرہ کا محتاج کیوں رہتا۔ یہ اس کے زبردست جذبۂ تخلیق کا فیض ہے کہ اس نے اپنے پیغام کی وضاحت اور اپنے بلند مقاصد کی تشریح کے لیے شاہین، شہباز اور عقاب کی تمثیلات سے کام لیا۔۔۔ مگر اقبالؒ کے کلام میں شاہین کا ایک خاص تصوّر ملتا ہے۔ جو اُن کے مخصوص تصوّرِ خودی کا تابع ہے۔

''شاہین ایک بلند پرواز، تیز نظر، تنومند، جفاکش، غیور اور بلند فطرت پرندہ ہے''۔۔۔ اور یہی ان کے نزدیک صحیح مردِ مومن کا کردار ہے۔ بلند فطری اور ذوقِ عمل، یہ تصوّر ان کے ہاں اس قدر تابناک ہے کہ جب وہ شاہین کی زبان سے اس کی سیرت بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی خونریزی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے۔۔۔''(40)

علامہ اقبالؒ نے مردِ مومن کو شاہین کے خطاب سے نوازا ہے۔ شاہین کا کام فضائے بے کراں کی وسعتوں میں پرواز کرنا ہے۔ اگر ایک آسمان کی پہنایاں اس کی پرواز کے لیے ناکافی ہوں تو دوسرے جہاں کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔ آرام طلبی اور کار آشیاں بندی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ کوہ بیاباں اور فضائے آسماں اس کی جولانیوں کا مرکز ہیں:

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذِلّت ہے کارِ آشیاں بندی

کارِ آشیاں بندی سے مراد دنیا کے جنجال میں پھنسنا، حیاتِ دنیا کو مقصود بنانا اور اپنے مقصد سے منہ موڑ کر آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا ہے اور یہ دونوں مقاصد اس کی زندگی سے خارج ہیں۔

اقبالؒ کے مسلک میں شباب، تن آسانی اور تن پروری کا نام نہیں ہے بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنا شباب کی صحیح تعریف ہے۔ یہ صفت ان کو شاہین میں ملتی ہے اور یہی وصف وہ مردِ مومن مین دیکھنا چاہتے ہیں۔

''اقبال صوفیائے سلف کی تعلیم نفیٔ خودی سے بیزار ہے۔ وہ قوم کی پستی و زوال کا سبب اسی غلط تعلیم کو قرار دیتا ہے۔'' مسکینی و محکومی و نومیدی جاویدی کا سبق دینے والے کو وہ ''گوسفند از گوسفندانِ قدیم'' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ وہ اپنے زبردست جذبۂ تخلیق کی مدد سے خودی کا ایک نہایت ارفع اور اعلیٰ تصوّر عطا کرتا ہے۔ اس کی حکیمانہ بصیرت، فلسفیانہ

استدلال اور شاعرانہ انداز بیان خودی کے لفظ سے غرور وخود پسندی کا مفہوم چھین کر اسے احساسِ نفس یا تعین ذات کے معنی پہنا دیتا ہے۔اس کے نزدیک استحکام خودی اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرنا اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ جب وہ قوم کے نوجوانوں میں خودی کا احساس نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے۔''(41)

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

.....

بے خبر تُو جوہر آئینہ ایام ہے
تُو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبالؒ نے اپنی شاعری میں شاہین کو ایک خاص علامت کی حیثیت سے پیش کیا ہے،اور یہ ان کا محبوب پرندہ ہے۔اقبالؒ کو اُردو شاعری کے محبوب پرندے بلبل سے کوئی رغبت نہیں، وہ اس پر شاہین کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے شعری وجدان کو زیادہ اپیل کرتا ہے۔اور اس کے ذریعے وہ حسبِ خواہش نئے اخلاقی نتائج مرتب کرتے ہیں ۔اقبالؒ نے تشبیہات واستعارات میں بھی بلبل وقمری کی بجائے باز اور شاہین کو ترجیح دی ہے۔شاہین ان کے ہاں مسلمان نوجوان کی ایک علامت کے طور پر بھی استعمال ہوا۔

اقبالؒ کو شاہین کی علامت حیثیت کیوں پسند ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے خود ہی اپنے ایک خط میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ظفر احمد صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں وہ تحریر کرتے ہیں:

''شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔(۱) خوددار ہے اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت نشین ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔''

یعنی اقبالؒ کو شاہین ایک بلند پرواز، بے نیاز، عزتِ مند، تیز نگاہ اور خلوت پسند ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یہی صفات ایک مردِ درویش یا مردِ مومن کی۔ وہ نوجوانوں میں بھی انہیں صفات کا پرتو دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ معاشرے کے بہترین افراد بن سکیں۔ اقبالؒ کی نظر میں شاہین کے علاوہ کوئی اور پرندہ اس حیثیت کا مالک نہیں کہ وہ نوجوانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکے۔ یہ اقبالؒ ہی ہیں جن کو شاہین کی ذات میں قوت، تیزی، وسعتِ نظر، دور بینی، بلند پروازی، درویشی، خودداری اور بے نیازی کی صفات نظر آئیں۔ اقبالؒ چونکہ ان صفات کو اپنی قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے شاہین کی جن صفات کا ذکر کیا ہے وہ اس پرندے کی فطری اور جبلی ہیں۔ اور اسے اس لیے عطا کی گئی ہیں کہ وہ ان کی مدد سے پرندوں کا شکار کر سکے۔ لیکن ملت کے نوجوان ان صفات کی مدد سے وہ اخلاقی بلندی حاصل کر سکتے ہیں جو انہیں ستارہ و مہ پروین کا شکار کھیلنا سکھاتی ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عزیز احمد ''اقبال۔۔۔نئی تشکیل'' میں لکھتے ہیں:

> ''شاہین کی قوت اپنی بقاء کے لیے کمزور قسم کے حیوانات سے متصادم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک حیاتی اور حیوانی صورتِ حال ہے جس کا انسانی اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن شاہین میں قوت کا رجحان بعض ایسی جبلی خوبیوں کی طرف پلٹ جاتا ہے جو اس میں اور اعلیٰ ترین انسانوں میں قدرِ مشترک بن جاتی ہیں۔ مثلاً غیرت، آزادہ روی، بلند پروازی، تیز نگاہی۔ شاہین ان خوبیوں کی طرف جبلت کے راستے پر پہنچا ہے۔ اس لیے اس میں یہ ناقص ہیں اور ان کے برعکس حیوانی زیادتی استیلاء کی درمیانی لکیر بہت مبہم اور غیر واضح ہے۔ لیکن جو جارحانہ رجحان شاہین کی منزل پر حیاتی ارتقاء میں نظر آتا ہے، اس کو انسان تسخیر فطرت کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ شاہین کا شکار کمزور پرندے ہیں، لیکن انسان کا شکار انسان کو نہیں ہونا چاہیے۔ جامد مادہ اور فطرت اور خود اپنی معاشرت جو انقلاب کی محتاج ہے، انسان کا اصلی شکار ہے۔ یہاں شاہین بطور رمز ہمیں ارتقاء یافتہ انسان کے قریب پہنچا دیتا ہے جسے اقبالؒ نے درویش یا فقیر کہا ہے۔'' (42)

اس بارے میں سیّد عابد علی عابد یوں کہتے ہیں:

''اقبال کے کلام میں انسانِ کامل کے لیے شاہین، مومن، قلندر اور درویش کے کلمات رمز کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ مختلف علامتیں استعمال کرنے کا منشا یہ ہے کہ انسانِ کامل کی ذات میں جو صفات مخفی و مستور ہیں ان کی کیفیت و کمیت سے پڑھنے والوں کو آگاہی حاصل ہو جائے۔ شاہین کہہ کر اقبالؒ 'انسانِ کامل کے فقر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس فقر سے مراد ترکِ دنیا نہیں بلکہ وہ استغناء ہے جو دنیاوی جاہ و جلال اور دنیوی خوف سے بے نیاز ہو کر طلب اور جستجو کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اور آخر تسخیر کائنات کے مقام پر پہنچتا ہے۔''(43)

اقبالؒ بار بار یہ نصیحت کرتے ہیں کہ شاہین کو کبوتر کنجشک رو اور زاغ اور کرگس کی محبت سے حذر کرنا چاہیے کہ شاہینی کی ارتقائی قوت ان مردار خور جانوروں کے ساتھ رہے تو وہ بھی مرہ اور افسردہ اور مردار خور ہوا جائے گی۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

غیرت اور خودداری درویش (قلندر/فقیر) کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ غیرت اسے خاک میں وہ دانہ ڈھونڈنے نہیں دیتی جو اوروں نے اسے کھلانے کے لیے ڈالا ہے۔ درویش اور فلسفی میں یہی فرق ہے کہ فلسفی گدھ کی طرح اونچا تو اڑ سکتا ہے لیکن شکار زندہ (حقیقت) تک پہنچنا اس کے نصیب میں نہیں۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم، سِرِّ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہین وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

اقبالؒ کو غیرت و بے نیازی اور فقر و استغناء کی صفات اتنی مرغوب ہیں کہ وہ بار بار ان کے اپنے اردو فارسی کلام میں ذکر کرتے ہیں۔ شاہین کی درویشانہ غیرت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ انسانِ کامل کے لیے ایک مثال بن جاتی ہے۔

غیرت ہے طریقت حقیقی
غیرت سے ہے فقر کی تمامی
اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن
شاہین سے تذرو کی غلامی

اقبال کے نزدیک فقر، مردِ درویش کی بہت بڑی خصوصیت ہے جس طرح شاہین چکور کی غلامی نہیں کرسکتا، اسی طرح فقیر اور درویش بھی کسی کمزور کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ کمزور تو ایک طرف رہا وہ تو شاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی

اقبالؒ کو شاہین کی یہ ادا بھی پسند ہے کہ وہ آشیانہ نہیں بناتا۔ اور وہ کوہ بیاباں میں گزراوقات کر لیتا ہے۔ آشیانہ بنانا اس کے فقر کی تذلیل ہے۔

گزراوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

''شاہین کی طرح مردِ درویش (قلندر۔فقیر) بھی اپنے لئے سرمایہ جمع کرنے اور بودوباش کی شان وشوکت کو اپنی درویشی کے خلاف سمجھتا ہے''

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبالؒ کو شاہین کی بلند پروازی اس لیے پسند ہے کہ یہ اس کے عزائم کو نئے نئے امکانات سے روشناس کراتی ہے۔ اقبالؒ کے شاہین (درویش یا نوجوان) کی پرواز گویا بلند ہمتی اور مقاصد آفرینی کی پرواز ہے۔ یہ کائنات

کے نئے نئے گوشے اس کی آنکھوں کے سامنے لاتی ہے۔ اقبالؒ شاہین کے اس وصف کو اپنے مردِ مومن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسے تسخیر کائنات کی ترغیب دیتے ہیں:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

اقبالؒ کا شاہین خلوت پسند ہے۔ وہ کبوتر اور چکور (تذرو) یا زاغ و کرگس (کوے اور گدھ) کی صحبت سے پرہیز کرتا ہے۔ اقبالؒ کو ایسا شاہین پسند نہیں جو کہ کرگسوں میں پلا بڑھا ہو۔ کیونکہ وہ راہ و رسم شاہبازی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ شاہین کی صحبت سے زاغ میں تو بلند پروازی نہیں آ سکتی لیکن صحبتِ زاغ شاہین کو خراب کر سکتی ہے۔

دونوں کی ہے پرواز اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

.....

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلندیٔ پرواز
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

اقبالؒ کو شاہین کی ایک اور خصوصیت پسند ہے اور وہ ہے اس کی تیز نگاہی اور دور بینی۔ یہی خصوصیت ان کے خیال میں ایک مردِ مومن میں بھی ہونی ضروری ہے۔ بغیر تیز نگاہ کے زندگی کی رکاوٹوں کو دور کرنا مشکل ہے۔ یہ اس کی بصیرت کی علامت ہے۔ شاہین کی وسعت پرواز اس کی نگاہوں کو وسعت بخشتی ہے اور دنیا کے مظاہر اس کی پُر تجسس آنکھ پر ایسے کُھل جاتے ہیں جیسے انسانِ کامل کی نگاہ میں زندگی اور کائنات کے اسرار۔ دوسرے پرندوں کو بھلا کا کیا پتہ جو فضائے نیلگوں کے پیچ و خم میں چھپے ہوئے ہیں اور جنہیں صرف شہباز کی تیز نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے۔

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز ، یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر

ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دمِ پرواز سرتاپا نظر

اقبالؒ بلند ہمتی، پیہم عمل، جدوجہد اور سخت کوشی کے مبلغ ہیں۔ ان کے نزدیک شباب، تن آسانی، عیش ونشاط اور تن پروری کا نام نہیں، بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام ہے۔ یہ صفت بھی شاہین میں ملتی ہے۔ اور اقبالؒ یہی وصف ''مردِ مومن'' میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مسلم نوجوانوں میں شاہین کی یہ صفات پیدا کر کے انہیں مجسمۂ حرکت وعمل بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ زندگی کی دشواریوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے نصب العین کو پاسکیں۔ اقبالؒ نے یہ سبق اس طرح دیا ہے کہ وہ ایک بوڑھے عقاب کی زبانی اپنے بچوں کو یہ نصیحت کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ سخت کوشی اور محنت کی بدولت ہی زندگی کی تلخیوں کو خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔

بچۂ شاہین سے کہتا تھا عقاب سالخورد
ہے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اقبالؒ، نوجوانوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ عزم وہمت کی بدولت ہی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ دنیا میں عزت و ناموری صرف بلند پروازی، بلند ہمتی اور سخت کوشی کی بدولت ہی ممکن ہے۔

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

عقاب کا مقام ستاروں سے اس لیے بلند ہے کہ وہ آسمان کی وسعتوں کو خاطر میں نہیں لاتا اور چیونٹی اس لیے پائمال وخوار ہے کہ وہ خاک سے بلند ہو کر اپنا رزق تلاش نہیں کرسکتی۔

اقبالؒ کو شاہین اسی لیے پسند ہے کہ وہ دوسرے پرندوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور توانا ہے۔ قوت اور توانائی اور اس کے تمام مظاہر اقبالؒ کو بہت مرغوب ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک زندگی کا اعلیٰ ترین اظہار قوت کی شکل میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان، روحِ اقبالؒ میں یوں بیان کرتے ہیں:

اقبال کے وجدان اور جذباتِ شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ یہی جوشِ

حیات ہے۔ جو اسے عالمِ انسانی اور عالمِ فطرت دونوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ قوت میں اسے حسن نظر آتا ہے۔ قوت اور توانائی، اظہارِ حسن کی ہی ایک خاص شکل ہے بشرطیکہ وہ اخلاق سے بے تعلق نہ ہو۔ اسی لئے وہ اسے فقر و بے نیازی سے وابستہ رکھتا ہے۔ بغیر اس کے اعلیٰ سیرت کے جوہر ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اقبالؒ کے ہاں قوت و توانائی کی نوعیت حیوانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ اقبالؒ دوسرے رومانیت پسندوں کی طرح قوتِ حیات کا قدر دان ہے۔ لیکن اسے اس کا شدید احساس ہے کہ قوت کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے اخلاقی نظم و ضبط کا پابند کرنا ہوگا۔ بغیر ایسا کئے قوت زندگی کے لیے لعنت بن سکتی ہے۔ اپنی نظم ''جلال و جمال'' میں وہ افلاطون کی تیزیٔ ادراک کے مقابلے میں زورِ حیدری کو زندگی کے لیے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔''(44)

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی
تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اقبال کے نزدیک ضعیفی سب سے بڑا جرم ہے۔ کمزور ہونے کا مطلب اپنے آپ کو موت کی دعوت دینا ہے۔ اس بات کو اقبال نے اپنی ایک نظم ''ابوالعلاء معری میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبالؒ اسی لیے اپنی ملت کے نوجوانوں کو شاہین صفت دیکھنا چاہتے ہیں اور کمزور اور مجبور انسان کو کبوتر، کنجشک، زاغ اور کرگس کہہ کر غیرت دلاتے ہیں کہ ان کی کمزوری ہی ان کے زوال اور نامرادی کا سبب ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
علامہ اقبالؒ تری پرواز لولاکی نہیں ہے

علامہ اقبالؒ قوم کے ہر فرد میں جرأت و دلیری اور قوت و توانائی کی صفات دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ وہ زندگی کی سختیوں اور دشواریوں کا مقابلہ کر سکیں۔

''فرمانِ خدا'' میں یوں فرماتے ہیں:

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اقبال کے فلسفہ میں ایک اور قدر کو بہت اہمیت حاصل ہے اور وہ ہے حُریت و آزادی۔ اقبالؒ کو یہ عظیم الشان قدر بھی شاہین کی ذات میں نظر آتی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ آزاد فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ اس وسعتِ پرواز کے باعث، حیات کی ایک اور بڑی قدر شاہین میں نمایاں ہوتی ہے، یہ آزادی ہے۔ شاہین کی وسعتِ پرواز یا اس کی نشوونما محض آزادی کی حالت میں ممکن ہے۔ ورنہ غلامی میں شاہین تذرو سے زیادہ بزدل بن جائے گا۔ غلامی شاہین کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

چنانچہ اقبالؒ کا شاہین کا فوری، میر و سلطان کا پالا ہوا باز ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا جو اپنی رفعتِ پرواز چھوڑ کر، پھر سے اپنے مالک کے پاس اور آب و دانہ کے پاس آ بیٹھتا ہے۔ جو محض میر و سلطان کے اشارے پر طیور کا شکار کرتا ہے۔ اقبالؒ کے شاہین کا فوری کے لیے آزادی انتہائی ضروری ہے۔ دریا و صحرا تو ایک طرف آسمان بھی اس کے زیرِ پر ہیں۔ بوڑھا باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ ''زدستِ کے طعمۂ خود بگیر'' کیونکہ یہی میر و سلطان کا دیا ہوا لقمہ تو باز کو غلام بناتا ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک آزادی کے عالم میں ہی شاہین کے لیے تجسس ممکن ہے۔ ورنہ غلامانہ ذہنیت تو اسے بزدل اور کمزور بنا دیتی ہے۔ شاہین کی پُر تجسس نگاہ اقبالؒ کی نظر میں اتنی ہی اہم ہے جتنا چیتے کا جگر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم یورپی علم کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن جب تک ہم میں تجسس کا مادہ نہ ہوگا ہم تخلیقی صلاحیت سے محروم رہیں گے۔

چیتے کا جگر چاہیئے ، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ افرنگ

یہ تجسس حصولِ علم کے لیے بھی ہے اور حصولِ قوت کے لیے بھی۔ عقاب کی آنکھ بڑی دور بین ہے۔ مردِ مومن کو بھی دور بین اور پُر تجسس ہونا چاہیئے۔ اسی کی بدولت حیات و کائنات کے اسرار کھلتے ہیں۔

اقبالؒ اپنی ملت کے نوجوانوں کو شاہین بچے قرار دیتے ہیں جو اگرچہ شاہینی صفات رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کو مناسب تعلیم و تربیت نہیں دی جاتی، جس کی وجہ سے ان کا دماغ کُند ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے خیال میں موجودہ تعلیم نفیٔ خودی کی تعلیم دیتی ہے اور وہ بلند کردار کے حامل انسان پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اقبالؒ جب اپنی قوم کے بچوں کو خودی سے عاری دیکھتے ہیں تو خدا سے دعا کرتے ہیں کہ:

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبالؒ کو یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب اور نئی تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو بے عمل، مذہب دشمن، بے کار، بزدل اور غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ اس کا سبب غلامانہ تعلیم قرار دیتے ہیں اور اربابِ تعلیم کے خلاف خدا سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اسلوب احمد انصاری ''مطالعہ اقبال کے چند پہلو'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے لیے فقر ایک ایجابی تصوّر ہے سلبی اور منفی نہیں۔ اور چونکہ حسیات سے اجتناب خود اختیاری ہے، اس لیے فقر کو انہوں نے جمالِ الٰہی کے ایک کرشمے کے طور پر متصور کیا ہے اور اسے قوت و شوکت اور جلال محض سے ممیّز کیا ہے۔'' (45)

ضربِ کلیم کی ایک نظم ''فقر و ملوکیت'' میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصّہ فرعون و کلیم

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زروسیم
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

ضربِ کلیم:

اقبالؒ نے ''ضربِ کلیم'' میں فقر کے جلالی اور جمالی دونوں پہلو دکھائے ہیں۔

(جلال و جمال)

میرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک!

ضربِ کلیم میں ''محراب گُل افغان کے افکار'' میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا، وہ عشق ید اللّٰہی
جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی، ناپید ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردک میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیمِ خود آگاہی

دُنیا ہے روایاتی ، عُقبیٰ ہے مناجاتی
درباز دو عالم را ، این است شہنشاہی

.....

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا
اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

(کلیاتِ اقبال، ارمغانِ حجاز، بڈھے بلوچ کی نصیحت)

اقبالؒ کو جمال سے زیادہ جلال پسند ہے بلکہ وہ تو جلال اور قوت میں بھی حُسن پاتے ہیں۔ اقبال کو ایسے پرندوں سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی جن کی اہمیت صرف جمالیاتی ہے یا جو حرکت کی بجائے سکون کے پیکر ہیں۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے ہے، طاؤس فقط رنگ

.....

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

صدائے غیب

نے نصیبِ ما رو کشردم نے نصیب دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لیے مرگِ ابد
بانگِ اسرافیل اُن کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد

مرکے جی اُٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوش لحد

(کلیاتِ اقبال، ارمغانِ حجاز، صدائے غیب)

خلاصۂ کلام فقر کچھ یوں ہوسکتا ہے کہ: وہ فقر جو توحید کا راز دار اور متاعِ مصطفویؐ کا امین ہو۔ جس کا ساز و برگ قرآنِ عظیم ہو اور جس کے عناصر صدق، اخلاص، نیاز، سوز، درد، ذوق وشوق، تسلیم ورضا، دلِ زندہ اور نگاہِ راہ بیں ہوں، وہ فقر اسلام کا مقصود ہے۔

علامہ اقبالؒ نہ صرف ''فقر'' کے لفظ کو بکثرت استعمال کرتے تھے بلکہ اپنے لیے فقیر، قلندر، درویش اور رند کے الفاظ پسند کرتے تھے۔ پیامِ مشرق میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

نہ شیخِ شہر ، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبالؒ
فقیرِ راہ نشین است و دِل غنی دارد

لیکن جب اقبالؒ عصر حاضر پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان کو ''خالص حجازی'' فقیر نہیں ملتے اور نہ ہی درویشِ حقیقی بلکہ ''فقر حجازی'' اب ''فقر عیار'' میں بدل چکا ہے:

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

لیکن اس فقر اور درویشی میں عیاری کے باوجود اقبالؒ ناامید نہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ آنے والا کل ''فقرِ غیور'' کا ہوگا۔ فرماتے ہیں:

اب تیرا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

غرض مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنی چاہیے کیونکہ اسی کی بدولت وہ حقیقی معنوں میں مومن بن سکتے ہیں اور مومن بن جانے کے بعد اپنی حیات ارضی کا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ فقر مسلمان کو کائنات پر حکمران بنا دیتا ہے۔ سُلطان یا بادشاہ فوج کے ذریعے سے فتوحات اور حکومت کرتا ہے۔ فقیر اپنی نگاہ سے فوج کا کام لیتا ہے۔ فقر کی بدولت انسان، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اور اس کا قلب مرکز تجلیات بن جاتا

ہے۔یعنی اسے جبرئیل سے ایک نسبت ہو جاتی ہے۔فقر کی بدولت آدم ،ظلِّ سبحانی بن جاتا ہے۔اس میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔اقبال کی رائے میں مسلمان محض اس لیے غلام ہو گیا ہے کہ اس نے فقر سے بیگانگی اختیار کر لی۔فقر اسلام کا دوسرا نام ہے۔دنیوی حکومت اور وجاہت یہ فقر کا ادنیٰ ثمرہ ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر ، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم فقیہہ و حکیم ، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ ،فقر ہے دانائے راہ

حواشی وحوالہ جات

1- حمید یزدانی، خواجہ، (مثنوی رومی میں ذکر رسولؐ) سہ ماہی مجلّہ اقبال ریویو (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، جولائی 1984ء، ص:14، 15)

2- اشفاق انور، موسیٰ خان جلال زئی، مترجم، مولانا رومؒ کا نظریہ عشق (لاہور، علم وعرفان پبلشرز، لوئر مال، 1999ء، ص:221)

3- جلال الدین رومیؒ، مولانا، مثنوی مولانا روم، دفتر اول۔ حصّہ سوم (لاہور، الفیصل ناشران، ص:366)

4- محمد ریاض، ڈاکٹر، رومی کا تصوّرِ فقر (لاہور، مقبول اکیڈمی، 1999ء، ص:251)

5- جلال الدین رومی، مولانا، مثنوی مولانا روم (لاہور، الفیصل ناشران، دفتر اوّل، حصّہ سوم، ص:776، 777)

6- محمد ریاض، ڈاکٹر، رومی کا تصوّرِ عشق (لاہور، مقبول اکیڈمی، 1999ء، ص:254)

7- قرآن مجید، آیت 88، سورۃ 28

8- مہر داد رخشندہ، مولانا جلال الدین رومی البلخیؒ، بمناسبت آٹھ سو سالہ جشن ولادت (راولپنڈی، خانۂ فرہنگ اسلامی ایران، 2007ء، ص:30)

9- خواجہ حمید یزدانی، ڈاکٹر، رومی کے اشعار میں تجلّی عشق، مجلّہ ایران شناسی، شمارہ، نمبر 3، (لاہور، خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران، 1994ء، ص:30)

10- لطیف اللہ، پروفیسر، رومی کا پیامِ عشق (کراچی، شہرزاد گلشنِ اقبال، 2005ء، ص:46)

11- پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (ص:20)

12- ایضاً (ص:816)

13- شہین مقدم صفیاری، دکتر، فقر در روشنی کلام اقبال، ترجمہ فارسی (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، 1989ء، ص:221)

14- شہین مقدم صفیاری، دکتر، فقر در روشنی کلام اقبال، ترجمہ فارسی

15- عزیز احمد، پروفیسر، اقبال کا انسانِ کامل، اقبال۔ نئی تشکیل (لاہور، گلوب پبلشرز، لوہاری گیٹ، 1968ء، ص:305، 306)

16- ایس۔ ایم۔ منہاج الدین، ڈاکٹر، افکار وتصوّراتِ اقبال (اوّل)، (ملتان صدر، کاروانِ ادب، 1985ء، ص:133)

17- ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر، اقبال کے نجومِ ہدایت (لاہور، فیروز سنز، 1991ء، ص:120)

18- ایس۔ایم۔نقوی، میجر، اقبال کا نظریۂ فقر، (راولپنڈی، ماہ نامہ فیض الاسلام، اکتوبر 1949ء، ص:27، 28)

19- صفدر حسین، اقبال کا فلسفۂ فقر (سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، جلد نمبر 5، شمارہ نمبر 4، اکتوبر تا دسمبر 2002ء، ص:75)

20- ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، ''علامہ اقبال کے دیگر صوفیانہ نظریات'' اسلامی تصوّف اور اقبال (لاہور، اقبال اکادمی، 1977ء، ص:348)

21- بالِ جبریل (لاہور، اقبال اکادمی ص:490)

22- بالِ جبریل، حصّہ دوم، (لاہور، اقبال اکادمی، ص:401)

23- صفدر حسین، اقبال کا فلسفہ فقر، سہ ماہی الاقربا، (اسلام آباد، جلد نمبر 5، شمارہ نمبر 4، اکتوبر تا دسمبر 2002ء، ص:78)

24- بالِ جبریل (لاہور، اقبال اکادمی ص:402)

25- مکتوباتِ اقبال (ص:203)

26- عزیز احمد، پروفیسر، اقبال کا انسانِ کامل ''اقبال۔نئی تشکیل'' (لاہور، گلوب پبلشرز، لوہاری گیٹ، 1968ء، ص:312)

27- اسعد گیلانی، سیّد، اقبال کا تصوّر خودی، تصوّرات اقبال (لاہور، فیروز سنز، 1991ء، ص:187)

28- شاہین دخت کامران، مقدم (صفیاری) دکتر، ''جاویدانِ اقبال'' (لاہور، اقبال اکادمی، 1986ء، ص:14)

29- اسعد گیلانی، سیّد، اقبال کا تصوّر خودی، تصوّرات اقبال (ص:189)

30- صفدر حسین، اقبال کا فلسفۂ فقر، سہ ماہی الاقربا (اسلام آباد، جلد نمبر 5، شمارہ نمبر 4، اکتوبر تا دسمبر 2002ء، ص:78)

31- بالِ جبریل (ص:77)

32- شاہین دخت کامران مقدم (صفیاری) دکتر، ایقان اقبال (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص:234)

33- محمد فرمان، پروفیسر، اقبال اور تصوّف (لاہور، بزمِ اقبال، ستمبر 2000ء، ص:28)

34- بہارالٰہ آبادی، تفسیر اقبال (سری نگر، گلشن پبلشرز، 1982ء، ص:156)

35- ضربِ کلیم، جاوید سے خطاب (ص:533)

36- ضربِ کلیم، علم و عشق (ص:533)

37- صلاح الدین احمد، تصوّرات اقبال

38- بالِ جبریل (ص:448)

39- بالِ جبریل (ص:495)

40- مغیث الدین، فریدی، خیابانِ اقبال (پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، 1966ء، ص:127)

41- مغیث الدین، فریدی، خیابانِ اقبال (ص:129، 128)

42- عزیز احمد، پروفیسر، اقبال۔ نئی تشکیل (لاہور، گلوب پبلشرز، لوہاری گیٹ) 1968ء، ص:265)

43- عابد علی عابد، سیّد، شعرِ اقبال (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء، ص:212)

44- یوسف حسین خان، روحِ اقبال، القمر انٹر پرائزز (لاہور، اُردو بازار، جنوری 1996ء، ص:135، 136)

45- اسلوب احمد، انصاری، مطالعۂ اقبال کے چند پہلو (ملتان صدر، کاروانِ ادب، 1986ء، ص:76)

باب ششم

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کے تصورِ فقر کا تقابلی جائزہ

علامہ اقبالؒ اور مولانا روم کے تصور فقر کا تقابلی جائزہ:

اللہ پاک کی آخری مقدس الہامی کتاب (قرآن مجید) میں سورۃ محمد ﷺ کی آخری آیت میں اللہ پاک خود فرماتا ہے:

''اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، کسی کا محتاج نہیں اور تم محتاج وفقیر ہو''

فقر کے لغوی معنی افلاس اور ناداری کے ہیں۔لیکن تصوف کی اصطلاح میں توکل الی اللہ اور قناعت کو فقر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔حدیث مبارکہ ہے کہ:

''الفقر فخری''

''فقر میرے لیے باعث فخر ہے''

اسی فقر کے بارے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا تھا۔فقیر کے شان کے شایان یہ ہے کہ وہ اپنے فقر سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کوئی دولت منداپنی دولت سے کرتا ہے۔صاحبِ دولت کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی دولت میں کمی واقع نہ ہو۔اسی طرح فقیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ اپنے فقر کو نقصان اور لازوال سے محفوظ رکھے۔

اس اسلامی تعلیمات کے دونوں ماخذوں (قران پاک اور حدیث مبارکہ) میں فقر کو ناداری کے معنوں میں نہیں بلکہ قناعت وتوکل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔المختصر فقر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو افلاس کے باعث انسان کو بھوک اور ننگ کا شکار بناتا ہے۔اسلام اس کے خلاف جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔اور فقر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان دنیاوی دولت حاصل ہونے کے باوجود اس سے بے نیاز رہتا ہے۔اسے اپنی زندگی پر مسلط نہیں کرتا۔اس کی ہوس کو دل میں جاگزیں نہیں ہونے دیتا۔اس طرح وہ دولت ہوتے ہوئے بھی فقر اختیار کرتا ہے۔یہی فقر ہے جو روح کو بالیدگی اور ذہن کو توانائی عطا کرتا ہے۔مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں یہی فقر ہے جو اسلامی تصوف کی شان ہے۔

پیر رومیؒ و مرید ہندی

علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو پیر رومیؒ کا روحانی تلمیذ کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ مولانا رومؒ کو ''پیر رومی''، اور ''پیر حق پرست'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی تمام تر تصانیف (علاوہ علم الاقتصاد) مولانا جلال الدین رومیؒ کی عقیدت مندی سے بھرپور ہیں۔

علامہ اقبالؒ اپنے پیر و مرشد کی عقیدت میں یوں اظہار کرتے ہیں:

چوں رومیؒ در حرم دادم اذاں من
ازو آمد ختم اسرارِ جاں من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او
بہ دور فتنۂ عصرِ رواں من

علامہ اقبالؒ نے ان اشعار میں شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیا بلکہ یہ اظہار حقیقت کے ساتھ زبردست نذرانۂ عقیدت بھی ہے۔ جو ایک مرید اپنے روحانی پیر و مرشد کے حضور پیش کر سکتا ہے۔

باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سر بستہ اسرارِ علوم
جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغ یک نفس مثلِ شرار

.....

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

.....

مرشد رومیؒ حکیم پاک زاد
سِرِّ مرگ زندگی برما کشاد

.....

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم
تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے

رازِ معنی مرشد رومیؒ کشود
فکر من بر آستانش در سجود

(کلیاتِ اقبال، فارسی)

اسی کے فیض سے ہے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے سر بے سجود ہیں جیحوں

.....

پیر رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

مثنوی مولانا روم تصوّف کے موضوعات پر بہترین کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اور علامہ اقبالؒ اس عظیم ہستی (مولانا رومؒ) کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کبھی تھکتے نہیں اور اپنے پیرومرشد کے فیوض و برکات برملا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

موجم و در بحر او منزل کنم
تا در تابندہ حاصل کنم
من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم
زندگانی از نفس ہائش کنم

(مثنوی مولانا روم)

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب فرماتے ہیں:

''فکر اقبالؒ کے مآخذ میں رومیؒ کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبالؒ رومیؒ کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ میرے میکدے کی شراب دراصل پیرروم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے۔ اقبالؒ زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومیؒ کے سر باندھتے ہیں۔''(1)

یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں جو اقبالؒ کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی ہیں، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی، طریقت کے دشوار گزار راستوں کے راہبر بھی ہیں اور حقیقت کے مرحلوں

کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں اور حکمت کے حقائق کے شارح بھی۔ غرض اقبالؒ کے نزدیک ہماری ''کرم خوردہ'' ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومیؒ ہے۔ جس کی تعلیمات کو اقبالؒ نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبالؒ اپنے آپ کو ''مثیلِ رومی'' قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہدِ قدیم میں رومیِ ملت کے لیے پیغام حیات لائے تھے۔ اور اس پُر آشوب دورِ حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ اور داعی ہیں۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق:

> ''اقبال نے مثنوی کو اثباتی فکر و عمل کی کتاب قرار دیا۔ اور اس کے فیض کی نئی نئی حدود دریافت کیں۔ انہوں نے بتایا کہ قرآن کے بعد جس کتاب کے ذریعے زمین و آسمان کو تسخیر کرنے والے علوم و حکمت تک رسائی ہوتی ہے۔ وہ مثنوی ہے۔ اور اس میں عصرِ حاضر کے ان پیچیدہ مسائل کا حل بھی موجود ہے جن سے حواس باختہ ہو کر اپنی تقدیر سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی بدولت ایک دبستان رومیؒ کی بنیاد پڑی اور اقبالؒ کے خاص نقطۂ نظر سے افکار رومیؒ کا تجزیہ ہونے لگا۔'' (2)

عام صوفیہ نے فنا اور ترک دنیا پر زور دینا تعلیم کا مقصود بنا لیا تھا۔ مولانا روم نے اس کو بقا اور ارتقاء کے نظریے سے بدل دیا۔ رومیؒ کے ہاں خودی کا استحکام لازمی ہے۔ ان کا طریقہ قوت تسخیر میں اضافہ کرتا ہے۔ عجمی تصوّف نے ترک حاجات کو خدارسی قرار دیا تھا۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ حاجت تو مصدر وجود اور منبع بہبود ہے۔ خدا کی خوبی ہے کہ بے نیاز ہے۔ بندے کی بندگی حاجات طلبی سے وابستہ ہے۔ لیکن رومیؒ اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ حاجات پست اور حیات کُش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہئیں۔ رومیؒ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان عبث پیدا نہیں کئے بلکہ کسی حاجت ہی سے کئے ہیں۔ اسی خیال کو اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ زندگی اور حیات و کائنات عبث نہیں ہیں اور نہ ہی خواہشات اور آرزوئیں عقل و حکمت کے منافی ہیں بلکہ زندگی کی بقا بلند اور ارفع مقاصد اور آرزوؤں سے وابستہ ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا ست
کاروانش را درا از مدعا ست
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است (3)

رومیؒ اور اقبالؒ کی مماثلت کچھ یوں قائم کی جاسکتی ہے۔

اقبالؒ کے ہاں رومیؒ صوری اور معنوی تتبع کی کافی مثالیں موجود ہیں۔

رومی: ہر نفس آواز عشق می رسد از چپ و راست
با فلک می رویم، عزم تماشا کراست

اقبال: خود ز فلک بر تریم و ز ملک افزوں تریم

علامہ اقبالؒ کی متعدد فارسی غزلوں کا لب ولہجہ مولانا رومؒ کی غزلوں کے انداز پر ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مولانا روم کی تقلید میں اپنے آپ کو ''رومی عصر'' کہا ہے۔ علامہ اقبالؒ جا بجا مولانا رومؒ کی تمثیلات کو ترجیح دیتے ہیں۔

اقبالؒ اپنے آپ کو رومیؒ کے مانند بُت شکن قرار دیتے ہیں:

خدا داند کہ مانند ابراہیم
بنا را و چہ بی پرواہ نشستم

مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کا مشترک موضوع ''قوتِ اشراق'' یعنی باطنی حواس کا قائل ہونا ہے۔ رومیؒ اور اقبالؒ نے ان موضوعات میں بڑے معانی پیدا کئے ہیں۔

رومیؒ کے ہاں ''عشق'' بڑے وسیع معانی رکھتا ہے۔ اور اقبالؒ کے ہاں اس سے بھی بڑھ کر۔ دونوں کے نزیک ''عشق'' ایک ایسی قوت ہے جو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری وساری ہے۔ اقبال کے تصور خودی کا لازمی عنصر یہی عشق ہے۔

بقول نیاز فتح پوری: علامہ اقبال کا رومیؒ سے متاثر ہونے کا سبب یہ تھا کہ ان کی روح کو جس چیز کی جستجو تھی وہ کہیں اور نہ مل سکی۔ وہ خود بھی فیلسوف تھے۔ دوسرے فلاسفہ کی بھی عقل آرائیوں کا غائر مطالعہ کر چکے تھے لیکن بندگی عقل سے جو تسکین انہیں حاصل ہوتی تھی وہ صرف منطقی قسم کی تھی، روحانی نہیں تھی۔ اس لیے جب انہوں نے رومیؒ کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اصل چیز بندگی عشق ہے اور ساری کائنات کا نظام اسی جذبہ سے وابستہ ہے۔

در عالم ہر کجا اسرارِ عشق
ابن آدم سرے از اسرارِ عشق

در جہاں ہم صلح ہم پیکار عشق
آب حیواں تیغ جوہر دار عشق

.....

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیراہن نہیں ہے

لیکن اقبالؒ کا عشق صرف اس کے چاک گریباں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ آگے بڑھ کر ''دامن یزداں'' تک پہنچ جاتا ہے جس سے مراد صرف ذاتی سعی و عمل کا انتہائی عروج و ارتقا ہے۔(4)

اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے رومیؒ کو سمجھنا چاہیے بلکہ اس کو مقبول عام بنانا چاہیے۔ اقبالؒ کے کلام میں بزرگان سلف کے اقوال کا استفادہ رومیؒ کی وساطت سے ہوا ہے یہاں تک کہ قرآن و حدیث کے معانی عالیہ بھی اقبالؒ نے بنیادی طور پر رومیؒ ہی کے توسط سے لئے ہیں۔(5)

اقبال کے افکار و تصورات اپنی اساسی حیثیت میں ان کی اولین شعری تصنیف اسرار خودی میں ملتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنے ان اعلیٰ خیالات کا آغاز بھی مولانا جلال الدین رومیؒ کے لافانی اشعار سے کیا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و ملولم دد انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

تصوّرِ خودی:

علامہ اقبال کا نظریہ خودی جو اقبالؒ کے کمال کی وجہ سے اپنا بن گیا ہے، اس کے بنیادی تصورات بھی مولانا رومیؒ کے ہاں ملتے ہیں۔

تقدیر:

تقدیر کے متعلق مولانا روم ایک متوازن نظریہ رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ میں نہ خود کو مختار کہہ سکتا ہوں نہ مجبور بلکہ درحقیقت ایک انقلاب انگیز خاک زندہ ہوں۔

مولانا روم: نہ مختارم نہ تواں گفتن نہ مجبور
کہ خاک زندہ ام در انقلابم

علامہ اقبالؒ اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت بدلی
نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت بدلنے کا

علامہ اقبالؒ کے ہاں مولانا رومی کا ذکر انتہائی محبت، ارادت مندی اور اشتیاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ رومیؒ کو اپنے فلسفے کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اگر رومیؒ بحر پُر آشوب ہے تو وہ اپنے آپ کو ساحل کا خریدار سمجھتے ہیں۔ اگر رومیؒ قافلہ سالار ہے تو وہ اپنے آپ کو اس قافلے کے معمولی راہرو سمجھتے ہیں۔ اقبال کی اکثر تصانیف پر رومیؒ کی قد آور شخصیت چھائی ہوئی ہے اور شاعر کی روح مشرق کے اس عظیم صوفی مفکر کے ذکر سے سرشار دکھائی دیتی ہے۔(6)

شر کی قوت سے نبرد آزمائی:

مولانا جلال الدین رومیؒ شر کی قوتوں سے مسلسل جنگ کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ خارجی اور داخلی شر کے خلاف مسلسل جہاد ہی انسان کو اپنی شخصیت کی نشوونما کا زریں موقع ملتا ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دشمن کو بھی استحکام اور ارتقائے ذات کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

درحقیقت ہر عدو مارے تست
کیمیائے نافع و دلجوئے تست

اسی بات کو علامہ اقبالؒ نے ''اسرارِ خودی'' میں حضرت علی ہجویریؒ کے زبان سے یوں ادا کیا ہے۔

راست می گویم عدو ہم یارِ تُست
ہستی او رونق بازار تُست

موت: زندگی جاوداں:

مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کی نظر میں زندگی ذوق سفر کا نام ہے اور دونوں کے نزدیک زندگی کے اس ابدی سفر میں موت ایک نہایت مختصر وقفہ ہے۔

رومی: مرگ را مرد است آید پیش من
تا کشم خودش درکنارش تنگ تنگ

اقبالؒ کے ہاں بھی موت سے کامل بے التفاتی اور زندگی کے ارتقائی اور زندگی کے ارتقائی تسلسل پر محکم ایمان ہے۔ وہ موت کو صید اور انسان کو صیّاد سمجھتے ہیں۔

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تو در کمینی

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ کا تصوّرِ فقر:

مولانا جلال الدین رومیؒ کے تصوّرِ فقر میں کم ہمتی اور تساہل پسندی کو بُرا کہا گیا ہے۔ زندگی میں نا امیدی سے بڑھ کر کوئی چیز خطرناک نہیں۔ دنیا میں کوئی کام بھی بخوبی انجام دینے کے لیے علم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ بعد ازاں اس پر عمل بھی بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد گوہر مراد دستیاب ہوتا ہے۔ اس کے لیے کسی پیشہ یا شعبہ کی تخصیص نہیں ہے۔ سعی و عمل کی فضیلت کو دل میں جاگزیں کرنا ضروری ہے۔

مولانا روم: دوں تریں کسبی کہ در عالم رود
ہیچ بی ارشاد استادی بود
اولش علم است آنگاہی عمل
تا دھد بر بعد مہلت تا اجل (7)

علامہ اقبالؒ اسی مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''مرد کاسب را حبیب اللہ گفت''

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علامہ اقبالؒ اپنی ملت کو پیغام دیتے ہیں کہ زندگی کے فلسفہ کو سمجھنا چاہیے۔اس کے لیے وہ پانی کی پتلی سی نہر سے مثال دیتے ہیں۔ساقی نامہ میں اس مفہوم کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ نہر کی روانی سے پانی کی طاقت اور قوت سامنے آتی ہے۔زندگی کا فلسفہ بھی یہی ہے۔زندگی میں نشیب وفراز ہیں اور رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں۔مگر یہ رکاوٹیں انسان کے لیے سدِ راہ نہیں ہوسکتیں۔

وہ جوئے کہستان اُچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دِل چیر دیتی ہے یہ (کلیات اقبال،اردو،ساقی نامہ)

مولانا جلال الدین رومیؒ اپنے پیغام میں تطہیر قلب پر تاکید فرماتے ہیں۔تاکہ انسان اخلاق رذیلہ سے نجات پاسکے۔مولانا ہر قدم پر قرآن مجید سے رہنمائی لیتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ اخلاقی رذیلہ سے گلوخلاصی کے لیے بے حد ضروری ہے کہ انسان حسد سے نجات حاصل کرے۔تاکہ فاسد خیالات دل میں مجتمع نہ ہوسکیں۔مثنوی مولانا روم۔دفتر اول میں یوں مذکور ہے۔

عقبہ زیں صعب تر در راہ نیست
اے خنک آں حسد ہمراہ نیست

''مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ حسد اور اس کے قسم کے فاسد خیالات پر قابو پانا ضروری ہے
تاکہ رقصِ روح وجاں نصیب ہوسکے۔''(8)

علامہ اقبالؒ اسی مفہوم کو اپنے طور پر یوں بیان کرتے ہیں

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

.....

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فقر کے لیے تطہیر قلب لازمی ہے۔ اور تطہیر قلب کے لیے روحانی فیوض اور تربیت بھی لازمی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مردِ کامل کی صحبت میں بیٹھا جائے۔ تاکہ فیضانِ نظر حاصل ہو۔

کیمیا پیدا کن از مُشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

.....

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ محبت سے روح کو طمانیت اور انسان کو روحانی سکون عطا کرتی ہے۔ اس سے رب کریم کی قربت ملتی ہے اور انسان کی روح کو ارفع مقام ملتا ہے۔ بقول مولانا رومیؒ "رباب کی زبان چاہے ترکی ہو، یونانی ہو، چاہے عربی ہو یہ محبت کرنے والوں کی زبان ہے۔"

راسخاں در تابِ انوارِ خدا
نے بہم پیوستہ نے از ہم جُدا

.....

ہر کہ باشد طالع او زاں نجوم
نفسِ او کفار سوزد ور رُجُوم

.....

خشمِ مریخی بناشد خشم او
مُنقلب رو غالب و مغلوب خو (9)

علامہ اقبالؒ اپنے روحانی مرشد کی تقلید میں رواں دواں ہیں اور محبت کی تلقین میں مولانا روم کے فلسفہ کے مطابق پیغام دیتے ہیں۔

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستان قصر و کسریٰ سے بے پروا

.....

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

.....

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی راہزن بھی ہے

.....

محبت ہی سے پائی شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

(کلیات اقبال، اردو)

فقر اختیاری:

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں کہ دل میں دولت کی ہوس پیدا نہ ہونے دے۔ کیونکہ یہ دل کی اسیری ہے اور موت ہے۔ مولانا رومؒ کی نظر میں دولت کا ہونا بُرا نہ تھا۔ البتہ اس کی خواہش اور ہوس دل کے لئے زہر قاتل ہے۔

مولانا روم: چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

علامہ اقبالؒ: علامہ اقبالؒ کے مطابق فقر کے لیے مادی اسباب سے بے نیازی کا جذبہ طرہ امتیاز ہے۔ علامہ اقبالؒ تاریخ اسلام سے مثالیں دے کر بتانا چاہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کے افراد کے قلوب فقر سے بھرپور ہوں نہ کہ دولت کی ہوس سے۔ علامہ اقبالؒ قلندری (فقر) کو افکار کی عظمت سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

.....

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیّور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

علامہ اقبالؒ قلندر قلندری کے کھو جانے کو عظمت کے کھو جانے سے مترادف سمجھتے ہیں۔

آہ کہ کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مال فقیری ، سلطنتِ روم و شام

.....

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میّسر تونگری سے نہیں

.....

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

علامہ اقبالؒ اس حقیقت کے قائل ہیں کہ جب تک مسلمانوں نے فقر کا دامن تھامے رکھا وہ پوری دنیا میں سب سے بڑی سیاسی اور مذہبی قوت بنے رہے۔

یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

مولانا جلال الدین رومیؒ اپنے کلام میں فرماتے ہیں:

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نی کہ برگردن برند

(مثنوی مولانا روم)

مولانا روم کا تصور فقر اللہ تعالیٰ سے نیاز مندی اور مخلوق سے بے نیازی برتنے کا نام ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ حقیقی فقر متوجہ الی اللہ رہتا ہے اور سفلی امور کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ مولانا کے نزدیک صوفیا (فقرا) ابوالوقت ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے نزد فقر متاعِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ فقر کسی صورت بھی زبوں حالی، کم بختی یا سربزیری نہیں۔ یہ متاع وہ ہے جسے آقائے کُل، سرورِ کون ومکان، سردار دو جہاں رحمتہ اللعالمین ﷺ نے اپنے

لیے پسند فرمایا۔ لہٰذا اسے دل سے متاعِ عزیز سمجھا جائے:

بے پراں را ذوق پروازے دھد
پشّہ را تمکین شہ بازے دھد
بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاج الماس می سازد ترا

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فقر افلاس نہیں بلکہ دولتِ جاودانی ہے۔

یہ فقر غیّور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

.....

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیّور

(کلیاتِ اقبال، اردو)

موت سے بے خوفی:

مولانا اور علامہ اقبالؒ کے مشترکہ مضامین میں موت سے بے خوفی شامل ہے۔ وہ مال ومنال کے بارے میں درجۂ وسط کے قائل ہیں۔ مولانا روم کی نظر میں موت کا مرحلہ ارتقائے حیات کا ایک مرحلہ ہے۔ لہٰذا اس سے خوف کیسا؟(11)

بقول مولانا روم: زندگی در مُردن و در محنت است
آب حیواں در درونِ ظلمت است

علامہ اقبالؒ اور مولانا روم دونوں موت کو زندگی جاوداں کی ایک منزل سمجھتے ہیں علامہ اقبالؒ مردِ مومن کی نشانی یوں بتاتے ہیں:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

.....

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد ازمرگ پاک است

ساقی نامہ میں یوں بیان ہوا ہے:

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

.....

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

دل کی اہمیت اور مقام:

مولانا روم کے تصورات میں دل کی بڑی اہمیت ہے۔ مولانا نے لاتعداد اشعار دل کی اہمیت کے بارے میں درج کئے ہیں۔ وہ ہمیں تلقین کرتے ہیں کہ عرفا (فقرا) کا دل اور عام دھڑکنے والے دل میں بہت فرق ہے۔

مولانا روم: گو اہلِ دل نہ ای بیدار باش
طالبِ دل باش و در پیکار باش

دل ایک عظیم نعمت ہے۔ اس کی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے رزقِ حلال لازمی شرط ہے۔

تو ہمی گوئی ترا دل نیز ہست
دل فرازِ عرش باشد نے بہ پست

علامہ اقبالؒ اپنے روحانی مرشد کی تلقینات کو اس انداز میں آگے لے کر جاتے ہیں:

علامہ اقبالؒ: قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

.....

زباں نے کہہ بھی دیا لا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

.....

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر

.....

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

.....

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

.....

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے

رہبانیت کا امتناع:

علامہ اقبالؒ اپنے مرشد روحانی سے سوال کرتے ہیں کہ راہبی اور ترک عمل کے بارے میں فرمادیں۔ مرید ہندی یوں سوال کرتے ہیں:

علامہ اقبالؒ: کاروباری خسروی یا راہبی
کیا ہے آخر غایت دین نبیؐ ؟ (12)

مولانا روم جواب دیتے ہیں کہ اسلام میں راہبی کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں دین کی مصلحت جنگ کا میدان اور ناموری ہے۔ جبکہ عیسائیت میں اس سے مختلف ہے۔

مولانا روم　　مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

اس سے ثابت ہوا کہ: ''مولانا روم اور علامہ اقبالؒ دونوں رہبانیت کے خلاف ہیں کیونکہ رہبانیت عمل کش ہے'' ۲ بال جبریل میں ''دین وسیاست'' میں یوں بیان کیا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری (13)

اقبال اور رومیؒ دونوں نے عشق کی بے حد تعریف کی ہے۔ مولانا کے ہاں عشق فنائے ذات کا سبب بنتا ہے تو علامہ کے ہاں عشق سے تعمیر ذات کا کام لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم اور علامہ اقبالؒ دونوں کے ہاں عشق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ علامہ مولانا کو عشق کا علم بردار قرار دیتے ہیں۔۔۔۔ یہ مولانا کا ہی فیض ہے کہ علامہ اس قدر عشق کے گرویدہ ہیں۔(14)

مولانا روم:　　شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

علامہ اقبالؒ:　　عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات ، عشق ہے نارِ حیات

اقبال نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے یہ مولانا رومؒ کے جذب و مستی کا ایک جدید ایڈیشن ہے اور یہی وہ راز ہے جو صحبتِ پیر رومؒ سے حضرت علامہؒ پر فاش ہوا۔ اور اقبالؒ نے بہ حسن و خوبی یہ راز عشق ہر قلب سلیم پر عیاں کر دیا۔''(15)

مولانا جلال الدین رومیؒ نے سوال اور گدائی سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس سے فقر کو ضعف ہو سکتا ہے اور تاکید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے رزق حلال مانگو۔

مولانا رومؒ:　　رزق از حق جو ، مجو از زید و عمر
مستی از حق جو ، مجو از بنگ و خمر

مولانا نے بڑی سختی سے دستِ سوال دراز کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ حقیقی فقرا اپنے درویش کو ایسا نہیں کرنے دیتا۔علامہ اقبالؒ کے خیال میں فقر کی بڑی خصوصیت غیرت ہے،سوال اور گدائی نہیں۔فقرِ غیور گدایانہ فقر سے بالکل مختلف ہے۔

علامہ اقبالؒ: اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دل گیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیر ی

مولانا روم کے نظریات کے مطابق توکّل نام ہے سعی وکوشش کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا۔اس کے پس پشت بے عملی نہیں ہونی چاہیے۔کیونکہ زندگی میں جمود نہیں بلکہ حرکت اور فعالیت ہے۔

مولانا رومؒ: جُز توکل جُز کہ تسلیمِ تمام
در غم و راحت ہمہ مکرست و دام

(مثنوی مولانا روم۔دفتر اول،ص:210)

اس طرح اقبال بھی فقر کی خصوصیات میں توکّل اور متاعِ یقین پر بے حد زور دیتے ہیں

علامہ اقبالؒ: یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

خودداری اور شاہینی خصوصیات:

مولانا رومؒ کے مطابق علامہ اقبال بھی خودداری اور جرأت کا درس دیتے ہیں۔یعنی انہوں نے فقرِ غیور کا درس دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ: غریبی میں ہوں محسودِ امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری

.....

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر

استغناءاور بے نیازی:

مولانا جلال الدین رومیؒ جہد مسلسل کا درس دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ درویش کے لیے استغنا اور بے نیازی کوفقر کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ جہاد اور مقاومت کا درس دیتے ہیں۔

ایں جہاں جنگ است کُل چوں بنگری
ذرہ با ذرہ چوں دیں با کافری

مولانا فرماتے ہیں کہ دولت سے استغنا اور بے نیازی برتی جائے تا کہ دل میں فقر مضبوط ہو سکے۔البتہ مولانا ترکِ دنیا کے حق میں نہیں ہیں۔علامہ اقبالؒ نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

.....

چوں علیؓ در ساز بانانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

مولانا روم اور علامہ اقبال فقر غیور کے ساتھ ساتھ فقر حر کی پرزور دیتے ہیں اور اس کی تاکید کرتے ہیں

مولانا روم اور اقبال کے تصور فقر کی اساس: لا الہ الا اللّٰہ

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

مولانا رومؒ مثنوی مولوی میں یوں ذکر کرتے ہیں

سایۂ یزداں بود، مر خدا مرد خدا
مردہ او زیں عالم و زندہ خدا
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس بات کو علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں:

تا عصائے لَا اِلٰـــہَ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

.....

ہر کہ حق باشد چوں اندر تنش
خم نہ گردد پیش باطل گردنش

.....

خوف را در سینۂ او رہ نیست
خاطرش مرغوب غیراللہ نیست

حواشی وحوالہ جات

1- سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، تشریحِ اقبال، مقالہ مندرجہ مجموعۂ اقبال (غلام دستگیر رشید، حیدرآباد دکن، 1946ء)

2- اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد نمبر 7، ص: 324، 327)

3- کلیاتِ فارسی (ص: 15)

4- نیاز فتح پوری، اقبال شناسی اور نیاز و نگار (1998ء، ص: 32، 33)

5- وزیر الحسن عابدی، سیّد، اقبال کے شعری مآخذ (ص: 88)

6- عبدالشکور احسن، پیر رومی و مرید ہندی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء، ص: 113)

7- مولانا جلال الدین محمد، رومی، مثنوی مولوی معنوی (لاہور، دفتر اوّل، الفیصل، ص: 338)

8- محمد ریاض، ڈاکٹر، مولانا رومؒ کا تصوّرِ فقر (لاہور، مقبول اکیڈمی، ص: 249)

9- مثنوی مولانا روم، دفتر اوّل (لاہور، الفیصل ناشران، ص: 290)

10- کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (ص: 816، 817)

11- خالدہ جمیل، مُباحثِ اقبال، اپنا ادارہ (لاہور، اُردو بازار، 2004ء، ص: 24)

12- کلیاتِ اقبال، اُردو (ص: 431)

13- حسن اختر، ملک، پیر رومیؒ و مرید ہندیؒ (سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء، ص: 243)

14- حسن اختر، ملک، پیر رومیؒ و مرید ہندیؒ (ص: 226، 228)

15- عمر فاروق ساہی، اقبال سے علامہ اقبال تک (لاہور، بساطِ ادب، 2001ء، ص: 116)

بابِ ہفتم

حاصلِ مطالعہ

حاصل مطالعہ:

حضرت علامہ اقبالؒ نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے عظیم فلسفی شاعر، اور نکتہ دان ہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ اُن کے لیے انتہائی ادب و احترام کے جذبات رکھتی ہے۔ اس کے پس منظر میں وہ تاریخی اور حکیمانہ افکار ہیں جو انہوں نے ہندی مسلمانوں اور پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے پیش کیے۔ اُن کے افکار ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

اس عظیم المرتبت ہستی نے اپنی تصانیف میں برملا اس کا اظہار کیا ہے کہ انہیں دو کتابوں نے روحانی طور پر بے حد متاثر کیا ہے۔ ان میں سے ایک الہامی کتاب قرآن مجید ہے۔ اور دوسری مثنوی مولانا رومؒ۔ اس صورت حال کے مطابق مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

من ز قرآں بر گزیدم مغز را
استخواں پیش سگاں انداختم

اب جب کہ حضرت مولانا رومؒ کا آٹھ سو سالہ جشنِ ولادت منایا جا رہا ہے اور اُن کے خیالاتِ عالیہ چار دانگِ عالم میں پھیل چکے ہیں۔ ہمارا اسلامی اور اخلاقی فرض ہے کہ اپنے اسلاف کی زریں تاریخ کا نہ صرف مطالعہ کریں بلکہ ان کے افکار و نظریات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔

بقول علامہ اقبال:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

بعینہٖ علامہ اقبالؒ اقوام کی غلطیوں کو نا قابل معافی گردانتے ہیں:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

چوں رومیؒ در حرم دادم ازاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او

بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

علامہ اقبالؒ نے اپنے روحانی پیرومرشد کے حضور جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔اس میں ایک تاریخ مضمر ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں ہر قسم کے فتنوں سے دوچار ہونا پڑا۔رسول کریمؐ کے وصال کے بعد عدم ادائیگی زکوٰۃ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔علاوہ ازیں جھوٹی نبوت کے دعوے داروں کی فہرست بھی طویل ہے۔اس ضمن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ نے جو مثالی کردار ادا کیا وہ ان کے ایمان اور روحانی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے بعد بھی تہذیب وتمدن اور سیاست کے نشیب وفراز سے اسلام کو دوچار ہونا پڑا۔اس کے لیے فتنہ تاتار بھی اسلام کے لیے ایک مصیبت سے کم نہ تھا۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کو اللہ تعالیٰ نے وہ روحانی بصیرت اور وجدان عطا فرمایا جس سے اس زمانے کے فتنوں میں ملّت اسلامیہ کو رہنمائی میسر آئی۔

بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: رومی کے زمانے میں شدید قسم کے سیاسی فتنے بھی تھے۔لیکن اقبالؒ جس فتنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ عقلی، اخلاقی اور روحانی فتنہ ہے۔رومیؒ کے عہد میں یونانی حکماء سے اخذ کردہ ایک محدود قسم کی عقلیت نے اسلامی عقائد کو منطق اور علم الکلام کی چیستان بنا دیا تھا اور سادہ روحانیت والے لوگ اس سے بے زار ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔تصوف ایک حیرت انگیز چیز بن گئی تھی۔

رہِ عقل جُز پیچ در پیچ نیست

بر عاشقاں جُز خدا ہیچ نیست

رومی کے زمانے میں مُلّا ظاہر پست رہ گیا تھا اور فقیہہ دفتر پرست۔۔۔رومیؒ اور اقبالؒ کے زمانوں میں کسی قسم کی مطابقت ہے اور ان دونوں نے اپنے اپنے زمانے کے احوال وافکار کی نسبت جو زاویہ نگاہ اختیار کیا اس میں بھی مماثلت ہے؟ رومیؒ کے زمانے میں ایک خاص قسم کے عقل علوم کا چرچا تھا اور ایک خاص انداز کا فلسفہ جزو تعلیم بن گیا تھا۔

مولانا روم اپنے زمانے کے تمام عقلی علوم سے بخوبی واقف تھے۔وہ ہر مسئلہ پر غیر معمولی بصیرت اور غیر معمولی جرأت سے تنقید کرتے تھے۔ن کی عقل صرف مادیات اور حیات تک محدود نہیں۔وہ عقل کو صفات اللہ کا ایک عالمگیر مظہر تصوّر کرتے ہیں۔چنانچہ مولانا رومیؒ عقل حجازی، عقل نباتی، عقل انسانی اور عقل نبوی کے مدارج کا ذکر کرتے ہیں۔مولانا کے مطابق رب کائنات کی خلقت اور مظہر حکمت سے خالی نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے جب روحانی بصیرت کی چشم بینا سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ مولانا رومیؒ کی تعلیمات کی اشاعت اس موجودہ زمانے میں اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ مولانا کے زمانے میں بھی تھی۔ ارمغان حجاز میں یوں فرماتے ہیں:

بکام خود آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز
ز اشعارِ جلال الدین رومیؒ
بہ دیوارِ حریم دل بیاویز

(کلیاتِ اقبال، فارسی، ارمغان حجاز، ص:104)

علامہ اقبالؒ نے شیخ سعدیؒ کی گلستان و بوستان، نظامی گنجوی کا سکندر نامہ حافظ شیرازی کا دیوان۔ مولانا روم کی مثنوی اور فردوسی کا شاہ نامہ بغور مطالعہ کیا تھا۔ مگر علامہ اقبالؒ نے مثنوی مولانا رومؒ سے ایک خاص قلبی لگاؤ محسوس کیا اور مولانا کو اپنا روحانی مرشد اور رہنما!

مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں نے اپنے زمانے کے عصری مسائل کو بہ نظر عمیق دیکھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ملتِ اسلامیہ کو منزلِ توحید پر پہنچانے کے لیے ان کو عجمی اور یونانی فلسفہ سے بچانا بے حد ضروری ہے۔ اور ایسے تصوف (غیر اسلامی) سے محفوظ کرنا بے حد ضروری ہے جو اس کو رہبانیت اور ترکِ دنیا کی طرف لے جا رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنے ذہنی انقلاب کی طرف اشارہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہی ایک طویل داستان ہے کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔(1)

رومی اور اقبالؒ کا عشق خودی میں خدا تعالیٰ کی صفات پیدا کرنے کا نام ہے۔ رومیؒ نے اس دور کے صوفی، ملا اور حکیم کے عقیدہ جبر اور تقدیر کے غلط مفہوم کی بجائے انسان کی خودی اور اختیار پرستی کا تصور پیش کیا۔ اقبالؒ کے ہاں بھی یہی تصور ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا کی ذات سے جو کچھ حاصل کیا اس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے وہ مولانا روم کے فیض کا ذکر یوں کرتے ہیں:

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

علامہ اقبالؒ نے مغربی مفکرین کے خیالات اور فلسفہ کا بھی مطالعہ کی تھا۔ اور پھر اُن کے تقابل میں مولانا روم کے نظریات کا تجزیہ پیش کر کے انہیں انسانوں کے لیے ایک مکمل اور شافی علاج کو سراہا۔

علامہ اقبالؒ کا یہ اظہار عقیدت لفظی نہیں۔ انہوں نے مولانا رومؒ کے نظریات کو فی الواقع اپنایا اور پھیلایا۔ ان کی رہنمائی قبول کی۔ مرید ہندی بن کر پیر رومیؒ سے سوالات کئے۔ ان کے تشفی بخش جوابات سُن کر شکوک و شبہات بھی دور ہوئے اور تسکین قلب بھی ملی۔

مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کے اشتراک ذہنی کے متعلق ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دونوں نے زندگی میں کوشش طلب، جدوجہد اور کشمکش اور پیکار کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ زندگی کے راستے میں مزاحمت قوتوں، دشواریوں اور کاوٹوں کو منفی نہیں بلکہ مثبت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ رکاوٹیں اور مزاحمتیں انسان میں خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتی اور اسے عمل پر ابھارتی ہیں۔ اور اس کے اندر شوکت، جلال، قوت ایسی صفات پیدا کرتی ہیں جو نصب العین کے حصول کے لیے بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں ان کے نزدیک مثالی انسان محض طاقت وشہ زوری کا مجسمہ نہیں بلکہ اس میں سوز و گداز اور دل کی نرمی بھی پائی جاتی ہے۔ جو اس میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا رومؒ میں ایک اور نمایاں اشتراک جو پایا جاتا ہے وہ ان کا پُر آشوب اور فتنہ انگیز عہد تھا۔ دونوں شخصیتوں نے اپنے زمانے کے حالات سے شدید تاثر لیا۔

علامہ اقبال اور مولانا روم تربیت روحانی کے لیے مُرشد کی زیارت اور اہمیت کے قائل ہیں۔ اور دونوں کے نزدیک نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی ذات ہی ایسی ہستی ہے جن کا اتباع نسل انسانی کے لئے باعث فخر و نجات ہے۔

دونوں عظیم فیلسوف اس طرح کی کوشش اور تعلیمات سے ملتِ اسلامیہ کو غیر اسلامی تصوف کے منفی رجحانات سے محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کلمہ گویان اسلام عجمی اور یونانی خیالات اور رجحانات کو نہ صرف اپنے دل سے بلکہ زندگی سے نکال باہر کریں۔ قرآن کریم اور سُنتِ رسول ﷺ کو اپنا محور و مرکز بنالیں۔ اور توحید پرستی میں تسبیح کے دانوں کی طرف مجتمع ہو جائیں۔ اپنی زندگی کو اسلام کی صاف سُتھری اور مطہر تعلیمات سے روشن کرلیں۔ دنیاوی ہوا و ہوس کو قریب نہ آنے دیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو حرزِ جاں کر لیں۔ رہبانیت کو ترک کر کے زندگی میں جدوجہد اور سعی و کوشش سے ایک نئی تازگی لائیں۔ اور پوری دنیا کو اپنے

اسلاف کی زریں تاریخ اور کردار سے باخبر کریں۔ اپنی زندگی کو ایمان کی روشنی سے منور کر کے اس پر کاربند ہوں اور اپنے طرزِ حیات کو قابلِ مثال بنائیں۔ بقول مولانا جلال الدین رومی:

''آدمی دیدست باقی پوست است''

علامہ اقبالؒ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ کا اجالا کر دے

حوالہ جات

1- بشیر احمد، ڈار، انوارِ اقبال (لاہور، اقبال اکیڈمی، 1977ء، ص:178)

کتابیات

کتابیات (بنیادی مآخذ)

☆ مولانا جلال الدین محمد، رومی مثنوی مولوی معنوی، دفتر اوّل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، چوک انارکلی، لاہور، مترجم مولوی محمد نذیر عرشی

☆ ایضاً دفتر دوم

☆ ایضاً دفتر سوم

☆ ایضاً دفتر چہارم

☆ ایضاً دفتر پنجم

☆ ایضاً دفتر ششم

☆ مثنوی مولویٔ معنوی، دفتر اوّل۔دوم، الفیصل ناشران اُردو بازار، لاہور، مترجم قاضی سجّاد حسین

☆ ایضاً دفتر سوم۔چہارم

☆ ایضاً دفتر پنجم۔ششم

محمد اقبال، ڈاکٹر کلیاتِ اقبال، اُردو

☆ ایضاً بانگ درا ، الحمرا پبلشنگ اسلام آباد

☆ ایضاً بالِ جبریل ، الحمرا پبلشنگ اسلام آباد

☆ ایضاً ضربِ کلیم ، الحمرا پبلشنگ اسلام آباد

☆ ایضاً ارمغانِ حجاز (اُردو) الحمرا پبلشنگ اسلام آباد

محمد اقبال، دکتر کلیاتِ اقبال، فارسی

☆ ایضاً اسرار و رموز ، مکتبۂ دانیال، لاہور

☆ ایضاً زبورِ عجم ، مکتبۂ دانیال، لاہور

☆ ایضاً پیامِ مشرق ، مکتبۂ دانیال، لاہور

☆ ایضاً جاوید نامہ ، مکتبۂ دانیال، لاہور

☆ ایضاً ارمغانِ حجاز ، مکتبۂ دانیال، لاہور

☆ مثنوی: پس چہ باید کرد اے اقوام شرق معہ مثنوی مسافر

کتابیات (فارسی)

☆ سیّد محمد اکرم اکرام، دکتر، اقبال و جہان فارسی، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۹ء

☆ سید محمد اکرم، دکتر، اقبال در راہِ مولوی، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء

☆ شہین دخت مقدم صفیاری، دکتر، نگاہی بہ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

☆ ایضاً، شرق و غرب در کلامِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۹ء

☆ شیخ محمد اقبال، دکتر، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

☆ محمد منور، پرفسور، غزلِ فارسی اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۷ء

☆ ایضاً، ایقانِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ء

کتابیات

☆ مظفر حسین برنی، مرتبہ، کلیات مکاتیب اقبال، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۳ء

☆ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، اسلامی تصوّف اور اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۵۹ء

☆ ابوالحسن، ندوی نقوشِ اقبال، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، ۱۹۸۸ء

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر اقبال اور مسلک تصوّف، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ اعجاز احمد، مظلوم اقبال، شیخ شوکت علی پرنٹرز، کراچی، ۱۹۸۵ء

☆ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر عروجِ اقبال، لاہور، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ اکبر حسین، قریشی مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۶ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر اقبال شناسی اور اوراق، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۹ء

☆ ایم ایس، ناز حیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ ایم۔ایم۔شریف، فلسفۂ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ تسلیم احمد تصوّر اقبالیاتِ نقوش، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء

☆ جابر علی، سیّد اقبال کا فنی ارتقاء، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۷۸ء

☆ جاوید اقبال، ڈاکٹر زندہ رود، جلد اوّل، غلام علی اینڈ سنز، لاہور

☆ جاوید اقبال، ڈاکٹر جلد دوم، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۳ء

☆ جاوید اقبال، ڈاکٹر جلد سوم، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆ حافظ شیرازی، دیوانِ حافظ، مرکزِ تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، لاہور، ۱۹۸۴ء

☆ حسن اختر ملک، ڈاکٹر اطرافِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء

☆ حسن رضوی، مرتب، اقبال کے فکری آئینے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

☆ حضرت مولانا عبدالرحمٰن، جامی نفحات الانس، اُردو مترجم حضرت شمس بریلوی، مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم۔اے جناح روڈ، کراچی، ۱۹۸۲ء

☆ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر فکرِ اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء

☆ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر حکمت رومی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

☆ رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر ارمغانِ اقبال، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

☆ رفیق خاور، اقبال کا فارسی کلام، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ ریاض قادری، محمد مناقب رومی، پروگریسو بکس، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷ء

☆ سعید اختر درانی، ڈاکٹر اقبال یورپ میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء

☆ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر شعاع صد رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆ سہیل بخاری، ڈاکٹر اقبال، مجدّدِ عصر، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۰ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر مطالعۂ اقبال کے چند نئے پہلو، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۴ء

☆ سیّد محمد عبداللہ، ڈاکٹر (مرتب) متعلقات خطبات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ شبلی نعمانی، مولانا سوانح مولانا روم، دارالشعور، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

☆ شبلی نعمانی، مولانا سیرۃ النبیؐ (مکمل) مکتبۂ تعمیر انسانیت، اُردو بازار، لاہور، سن ندارد

☆ شفیق الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر اقبال کا تصوّرِ دین، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆ صابر حسن کلوروی، ڈاکٹر تاریخ تصوّف، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۵ء

☆ صدیق جاوید، اقبال پر تحقیقی مقالے، لاہور، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر اقبال کے نجوم ہدایت، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆ عابد علی عابد، سیّد شعر اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء

☆ عابد علی عابد، سیّد تلمیحاتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء

☆ عبدالسلام، ندوی اقبالِ کامل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء

☆ عبدالعلیم، صدیقی سیرِ افلاک۔ جاوید نامہ کا منظوم اُردو ترجمہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۰ء

☆ عبدالشکور احسن، ڈاکٹر اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ عبدالمجید، سالک ذکرِ اقبال۔ بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۵ء

☆ عزیز احمد، اقبال۔ نئی تشکیل، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ علی بن طالب، حضرت نہج البلاغہ، مطبوعہ دارالکتب، العربیہ الکبریٰ، مصر، سن ندارد

☆ عمر فاروق، ساہی اقبال سے علامہ اقبال تک، بساطِ ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ عمران لیاقت حسین، رومی و اقبال در حکمتِ قرآن، مکتبۂ جدید، کراچی، ۱۹۸۱ء

☆ غلام جیلانی خان، لفٹیننٹ کرنل اقبال کے عسکری افکار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

☆ فتح محمد ملک، پروفیسر اقبال فکر و عمل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

☆ قمر اقبال، بیاض بانگ درا۔ بحوالہ مقالہ ایم۔فل اقبالیات، بانگ درا حصّہ سوم (نظم ارتقاء کے بعد) مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

☆ کلیاتِ اقبال اُردو، اقبال اکادمی پاکستان بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء

☆ محمد اسلم، انصاری اقبال عہد آخرین، کاروانِ ادب، ملتان صدر، ۱۹۸۷ء

☆ محمد اقبال، علامہ جلد دوم ۱۹۵۴ء

☆ محمد اقبال، علامہ اقبال نامہ جلد اوّل، مرتبہ، شیخ عطا محمد، محمد اشرف اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۴۴ء

☆ محمد اکرام، چغتائی اقبال اور گوئٹے، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ محمد باقر، پروفیسر منشوراتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ محمد حمزہ، فاروقی حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ محمد ریاض، ڈاکٹر افادات اقبال، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۳ء

☆ محمد ریاض، ڈاکٹر اقبال اور فارسی شعراء، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ محمد زمان، پروفیسر اقبال اور تصوّف۔ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ محمد صدیق خان شبلی، ڈاکٹر ڈاکٹر محمد ریاض، فارسی ادب کی مختصر تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

☆ محمد عبداللہ، قریشی روح مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر تلاشِ اقبال، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء

☆ محمد منور، پروفیسر برھانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء

☆ محمد منور، پروفیسر قرطاس اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸ء

☆ محمد یونس سیٹھی، وفا نوائے رومی، لیوبکس، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

☆ معین الدین، فرہنگ فارسی، جلد نمبر ۵، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۶ ش

☆ مقبول انور، داؤدی مطالبِ اقبال، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۰۴ء

☆ مولانا الطاف حسین، حالی حیاتِ سعدی، لاہور، فرمان علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد،

☆ نظر حیدر آبادی، اقبال اور حیدر آباد، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء

☆ وحید الدین فقیر، سیّد روزگارِ فقیر، حصّہ اوّل۔دوم

☆ وقار عظیم، سیّد اقبال شاعر اور فلسفی

☆ یوسف حسین خان، ڈاکٹر روحِ اقبال۔القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء

☆ یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوّف، دارالکتاب، لاہور، سن ندارد

تحقیق مقالات

☆ ارشاد احمد شاکر، ڈاکٹر، جاوید نامہ، حواشی و تعلیقات، مقالہ پی۔ایچ ڈی اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ افتخار احمد، اقبالیات محمد الدین فوق، مقالہ برائے ایم فل اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ عبدالواجد تبسم، سلیم احمد بطور اقبال شناس، مقالہ ایم فل اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ قمر اقبال، بانگِ درا (حصّہ سوم) نظم ارتقاء کے بعد، مقالہ ایم فل اقبالیات مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ محمد اکرم، ڈاکٹر، کلامِ اقبال میں تاریخی شخصیات اور اُن کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط کا جائزہ مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ محمد اکرم، علامہ اقبال اور تحریک اتحاد اسلامی (متونِ اقبال کی روشنی میں) مقالہ ایم فل اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ نجیبہ عارف، بالِ جبریل کی غزلیات، رباعیات وقطعات پر محققانہ حواشی، مقالہ ایم فل اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

☆ نگہت پروین، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر (فکری وفنی جائزہ) مقالہ ایم فل اقبالیات، مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

انگریزی کُتب

1. Dr. Khwaja Abdul Hamid Irfani, The Sayings of Rumi and Iqbal, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2003.
2. Allama Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2003.
3. Thoughts and Reflections of Iqbal, Sh. Muhmmad Ashraf, Lahore, 1964.
4. The Secrets of the Self (Asrar-i-Khudi) Translated by Reynold A. Nicholson, Kitabbhaven, New Delhi, 2000
5. Afzal Iqbal, The Life and work of Jalal ud Din Rumi, Oxford University Press, Karachi, 2003.
6. The Metaphysics of Rumi, Dr. Khalifa Abdul Hakeem, Institute of Islamic Culture Club Rd, Lahore, 1999.

انسائیکلوپیڈیا

☆ اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۰ء

☆ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ولیم۔ایل۔لینگر، ترجمہ (غلام رسول مہر) لاہور، ۱۹۸۵ء

☆ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، سید قاسم محمود الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور

رسائل و جرائد

☆ اقبال ریویو، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۳ء

☆ اقبالیات، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۱۹۸۱ء

☆ برگِ گل، اقبال نمبر، وفاقی گورنمنٹ کالج، کراچی، ۱۹۷۷ء

☆ رضا مصطفوی سبزواری، ڈاکٹر (سہ ماہی) پیغام آشنا، علامہ اقبال خصوصی نمبر، شمارہ نمبر ۱۱/۱۲، ثقافتی قونصلیٹ، اسلامی جمہوری ایران، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

☆ سیّارہ، اقبال نمبر اوّل، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء

☆ صحیفہ، اقبال نمبر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۳ء

☆ صحیفہ، بزمِ اقبال، لاہور، نومبر ۱۹۸۶ء

☆ علی اورسجی، سہ ماہی پیغام آشنا، شمارہ ۲۰، ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

☆ فکر و نظر، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

☆ کتاب (ماہ نامہ) اقبال نمبر، لاہور، نومبر ۱۹۷۷ء

☆ ماہِ نو، اقبال نمبر، ۳۰ سالہ انتخاب ماہ نو، ۱۹۷۷ء

☆ محمد طفیل، مرتبہ، نقوشِ اقبال نمبر، فروغ اُردو، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
Acc. No.
Date.